مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان
اردو بازار کراچی

فہرست مضامین

اشاعت ـــــــــ مارچ ۱۹۷۶ء

باہتمام ـــــــــ محمد اشرف عثمانی

طباعت ـــــــــ عرفان افضل پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ـــــــــ ادارہ اسلامیات لاہور

قیمت ـــــــــ

ملنے کے پتے :-

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

دارالاشاعت مولوی مسافرخانہ کراچی

ادارۃ المعارف ، کراچی ۱۴

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

کے حساب سے دیکھا جائے تو سینکڑوں زبانوں کی بولنے والی قومیں شریک ہیں۔ یہی حال نسلوں کا ہے۔ شاید ہی آدم کی اولاد کی کوئی قابل ذکر نسل ایسی باقی ہو گی جس کے افراد "امت اسلامیہ" کے اس وسیع دائرے میں شریک نہیں ہیں۔ ان میں سامی آریائی، تورانی نسلوں کے گورے، کالے، لال، پیلے سب ہی رنگت کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

ستر کروڑ مسلمانوں میں صرف دو تین مذہبی فرقے پائے جاتے ہیں

لیکن ان باتوں کے باوجود نصف ارب سے زیادہ تعداد والی اس اُمت میں اگر دیکھا جائے تو دس بیس نہیں واقعہ یہ ہے کہ تین چار فرقوں سے زیادہ ایسے گروہ نہیں مل سکتے۔ جن کے اختلاف و تفریق کو واقعی اختلاف و تفرق قرار دیا جا سکتا ہے سب سے بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہیں اہلسنت والجماعت یا سنی مسلمان کہتے ہیں ان کے بعد دوسرا طبقہ شیعوں کا ہے اور جی چاہے تو مسقط اور عمان جیسے ساحلی علاقوں یا افریقہ کے بعض دور دست خطوں میں رہنے والے خوارج یا خارجی مسلمانوں کو بھی مسلمانوں کے تیسرے فرقے کی حیثیت سے شمار کر لیجئے۔ حالانکہ جہاں کروڑوں کی بات ہو رہی ہو وہاں خارجی مسلمان جن کی تعداد جہاں تک میرا خیال ہے لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے بھی بمشکل متجاوز ہو سکتی ہے ان کا شمار کرنا تمسخر کے سوا کچھ اور بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ لے دے کر یہی سنی اور شیعہ دو فرقے مسلمانوں میں ایسے ضرور ہیں، جنہیں اس سلسلہ میں واقعی اہمیت حاصل ہے، ان دونوں فرقوں کے اختلافات یقیناً ایسے اختلافات ہیں جن کی بنیاد پر کسی مذہبی اُمت کا ایک فرقہ دوسرے فرقے سے جدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اہلسنت والجماعت کی تعداد کی کثرت کا مقابلہ

مسلمانوں کے مذہبی فرقوں اور پارٹیوں کی بھی بڑی لمبی چوڑی طویل الذیل فہرست پائی جاتی ہے لیکن جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کاش اس کی زحمت بھی اسی کے ساتھ اٹھائی جاتی کہ اس کتابیہ فہرست کو واقعات کی دنیا پر منطبق کر کے دیکھا جاتا کتابوں میں بے شک مسلمانوں کے ان نت نئے بھانت بھانت فرقوں کا ذکر ضرور پایا جاتا ہے لیکن ان فرقوں کا اور ان کے طرح طرح کے ناموں کا وجود دنیا میں باقی رہا ہے یا اس کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی ورنہ ان پر واضح ہوتا کہ کتابوں کے سوا اب ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

فرقہ بندیوں کی کثرت ابتدا اسلام میں کیوں ہوئی

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پہلے تو سیاسی اختلافات نے کچھ مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا اور ان ہی سیاسی اختلافات کی بنیاد پر کچھ پارٹیاں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں جو واقع میں تو تھیں سیاسی پارٹیاں لیکن اس زمانہ کے خاص مذاق اور ماحول نے ان سیاسی پارٹیوں کو مذہبی فرقوں کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔

"سیاست ہی اسلام کی روح ہے"

فتنہ کی ابتدا اسی مسئلہ سے ہوئی

ان سیاسی اختلافات کی ابتدا ریح پوچھیے تو اس مسئلہ سے ہوئی یعنی ایک طرف مسلمانوں میں ایک گروہ ان لوگوں کا پیدا ہو گیا جن کے نزدیک اسلام کا سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ اقدم عنصر سیاست تھا شہرستانی

اگر شیعہ فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد سے کیا جائے تو گو خوارج کی طرح ان کو قریب
صفر قرار دینا تو حقائق و واقعات کی تکذیب ہوگی لیکن ساٹھ اور ستر کروڑ کے درمیان
مسلمانوں کی جو تعداد ہے اس میں سے بمشکل چند کروڑ کو الگ کر دینے کے بعد باقی صرف
سنی مسلمان رہ جاتے ہیں یعنی صحیح طور پر شیعہ طبقہ کے مسلمان کی تعداد بتایا نہیں سکتا
لیکن جن جن ممالک میں شیعہ طبقہ کے لوگ آباد ہیں ہم ان سے بھی واقف ہیں اور یہ
بھی جانتے ہیں کہ ایران کے سوا اسلامی ممالک میں شاید ہزار میں ایک سے زیادہ ثابت
ہونا ان کا آسان نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں
منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اسلام کی یہ بھی گویا ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ
جہاں غیر اسلامی اقوام میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ایک مذہب ایک ایک دین کے
ماننے والوں میں سینکڑوں فرقے پائے جاتے ہیں اور کیسے فرقے؟ کہ ان کے معبود بھی
ایک میں اتفاق نہیں اور نہ تو اور گویا خدا پر بھی وہ متفق نہیں ہیں۔ قوموں کا جائزہ
اس نقطہ نظر سے لیجئے۔ کتابوں میں پڑھئے یا گھوم پھر کر دیکھئے تو آپ مبہوت ہو کر
رہ جائیں گے کہ مذہب کی بنیاد پر جہاں ایک ایک قوم اتنی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی
ہے وہیں دو یا زیادہ سے زیادہ تین فرقوں میں مسلمانوں کے دینی اختلافات منحصر ہو
کر رہ گئے ہیں۔

مغالطہ کی وجہ

مغالطہ در اصل لوگوں کو ان کتابوں سے ہو جاتا ہے جو ملل و نحل کے عنوان
پر مسلمانوں کے ہاں وقتاً فوقتاً لکھی جاتی رہی ہیں یعنی فرقوں اور طبقوں کے حالات
جن میں بیان کئے گئے ہیں ان کتابوں میں یہ درست ہے کہ فرقوں کے ساتھ ساتھ

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بعضوں نے یہ پھیلانا بھی شروع کیا کہ

ان الدنیا لا تفنی — دنیا کا موجودہ نظام کبھی فنا نہ ہوگا۔

اور کہتے تھے کہ مذاہب و ادیان جنت و دوزخ وغیرہ کے الفاظ اور اصطلاحیں جو پائی جاتی ہیں ان کا مطلب بقول شہرستانی ان کے نزدیک یہ تھا کہ

الجنۃ ھی التی تصیب الناس من خیر ونعمۃ وعافیۃ وان النار ھی التی تصیب الناس من شر ومشقۃ وبلیۃ (ذیل ملل شہرستانی)

لوگوں کو دنیا میں جو بھلائیاں میسر آتی ہیں اور جو نعمتیں ملتی ہیں سکھ اور راحت کی زندگی کے پالیتے ہیں کامیاب بس اسی کا نام جنت ہے اور برائیاں یعنی مصائب جنہیں دنیا میں لوگ جھیلتے ہیں بس یہی جہنم ہے۔

مقصد ان لوگوں کا یہی تھا کہ اچھی حکومت میں باشندوں کو امن و امان کی وجہ سے جن راحتوں اور نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے مذاہب نے سکھ کی اسی زندگی کا نام جنت رکھ دیا ہے اور حکومت کی بدانتظامی کی وجہ سے جن مصائب و آلام، بے چینی اور بدامنی کے شکار لوگ ہو جاتے ہیں اس کی تعبیر مذاہب میں جہنم سے کی گئی ہے۔

قریب قریب یہ اسی قسم کی بات ہے جو اس زمانے میں بعضوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہے کہ فتوحات کی وجہ سے دجلہ، فرات، نیل اور گنگا کی جن نہروں اور دریاؤں پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے والا تھا اور بڑے زرخیز زیر زمین عریض و طویل ممالک جو مسخر ہونے والے تھے، قرآن میں مسلمانوں سے ان ہی چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا اس کی تعبیر جنت سے کی گئی تھی اور ان ہی چیزوں سے محروم ہو جانے کے بعد جن حالات میں مسلمان مبتلا ہونیوالے تھے ان کو قرآن نے جہنم کے لفظ سے ادا کیا تھا۔

کے الفاظ میں ان کا خیال تھا کہ

ما كان في الدين والاسلام	دین اور اسلام میں اس سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں
أمر أهم من تعيين الامام	ہے کہ امام یعنی مسلمانوں پر حکمرانی کی باگ جس کے سپرد
حتى تكون مفارقته الدنيا	ہو، اس کو متعین کر دیا جائے تاکہ دنیا سے جاتے ہوئے
على فراغ من امر الأمة	امت کے متعلق پیغمبر کے دل میں کسی قسم کی تشویش
(ص ۱۰۱ ج ۱)	باقی نہ رہے اور اطمینان کے ساتھ دنیا کو چھوڑ دیں۔

سیاست کی اسی غیر معمولی اہمیت کے احساس نے ان میں بعضوں کے اندر یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا جیسا کہ شہرستانی ہی نے لکھا ہے کہ

الدين امران معرفة الامام	امام (جو حکومت کی تنظیم کرے) اس کا پا لینا اور امانت کا
واداء الامانة۔	ادا کرنا بس ان ہی دونوں چیزوں کا نام دین ہے۔

مطلب گویا ان کا یہ تھا کہ حکومت کی تنظیم اور باشندوں میں اس احساس کا پیدا کر دینا کہ باہم ان میں ہر ایک دوسرے کا امین ہے یوں دھوکہ فریب وغیرہ کے عیوب سے ملک جب پاک ہو جائے تو مذہب کا مقصد پورا ہو گیا، بغیر کسی پس و پیش کے وہی کہا کرتے تھے، شہرستانی نے نقل کیا ہے کہ:

"حکومت کی تنظیم اور احساس امانت کو پیدا کر لینے میں کامیاب ہو جانے کے بعد پھر کسی قسم کا کوئی شرعی مطالبہ باقی نہیں رہتا۔ (ص ۱۵۲ ج ۱)

ان ہی میں بعض ایسے بھی تھے جو امانت والی قید کو بھی حذف کر دیتے تھے اور مدعی تھے کہ

الدين معرفة الامام فقط	دین صرف امام یعنی حکومت کی تنظیمی قوت کے قائمہ کا پا لینا ہے۔

حالانکہ عموماً اس گروہ کی اکثر ٹولیوں کا خیال تھا کہ اپنے بعد پیغمبر نے اسلامی حکومت کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نامزد کر دیا تھا لیکن سیاست ہی دین کی اصل روح ہے اسی خیال نے بعضوں میں اس قسم کے رجحانات بھی پیدا کر دیے تھے، جیسا کہ شہرستانی نے لکھا ہے کہ :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابیوں پر کفر کا الزام لگاتے تھے حتیٰ کہ حضرت علی کو بھی نہیں بخشتے تھے"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ان کا یہ اعتراض تھا کہ :-

"اپنے جائز حق کے مطالبہ میں انہوں نے غفلت سے کام لیا حالانکہ ان پر واجب تھا کہ کھل کر میدان میں آجاتے اور جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے" (ملل و نحل شہرستانی)

ان ہی لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ابن حزم نے لکھا ہے کہ گو فرقہ کے بانی کا خیال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق بھی تھا لیکن بعد کو :-

"اس گروہ کے عام افراد کا مسلک یہ ہو گیا تھا کہ عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد علی مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گئے تھے یعنی جب کھل کر وہ میدان میں آگئے اور تلوار ہاتھ میں سونت لی"

واللہ اعلم بالصواب اس موقعہ پر ابن حزم نے اسی گروہ کے بعض افراد کی طرف (العیاذ باللہ) عجیب گھنونے یا دل دوز یہ خبیث نظریہ بھی منسوب کیا ہے کہ :-

الذنب فی ذلک الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ لم یبین الامر بیاناً قطعاً

قصور در سیاست کے اس باب میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ مسئلہ کو انہوں نے اس طریقہ سے کھولا

اور یہ تو گویا ان کے اعتدال پسندوں کا خیال تھا لیکن حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اسی سلسلہ میں کچھ لوگ اسی طبقہ میں جو سیاست ہی کو اسلام کا سب کچھ قرار دیتے تھے اس حد تک ترقی کر کے پہنچ گئے تھے کہ حکومت کے قائم کرنے والی قوت سے مزاحمت کرنے والوں کو جہنم کے نام سے کہتے تھے کہ قرآن میں موسوم کیا گیا ہے۔ شہرستانی کے بجنسہ الفاظ ان کے اس خیال کے متعلق یہ ہیں کہ

ان الجنة رجل امرنا بموالاتہ	جنت اس شخصیت کی تعبیر ہے جس کی پشت پناہی
وھو امام الوقت و ان النار	کا ہمیں حکم دیا گیا ہے یعنی وقت کا امام (حکمران) اور
رجل امرنا بمعاداتہ وھو	اس حکمران کے دشمن کا نام دوزخ ہے جس کی مخالفت کا
خصم الامام۔ صفحہ ۱۳۷	ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

نماز روزہ والا اسلام عامیانہ دھرم ہے

ان کے نزدیک نماز روزہ والا اسلام ایک عامیانہ دھرم سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا اسی بنیاد پر بقول شہرستانی ان میں کہنے والے کبھی کبھی یہ بھی کہتے کہ:

> موالنص (مثلاً نماز روزہ، حج و زکوٰۃ) وغیرہ سے مطلب یہ ہے کہ ان قوتوں کے آگے بڑھانے میں ہم اپنی توانائیوں کو خرچ کریں جن کی پشت پناہی حکومت کے صحیح نمائندے یعنی امام کے لیے ضروری ہے اور محرمات یعنی جو باتیں مذہب میں حرام اور ناجائز ہیں ان سے مقصد ہے کہ اس راہ میں جن کی مخالفت ضروری ہے ان سے ہم کنارہ کشی رہیں۔ (ملل ج ۱ ص ۱۳۵)

یہ ایک اجمالی عنوان تھا جس کے نیچے وہ ساری باتیں درج تھیں۔ جن پر
آج کل عموماً یورپ کی سیاست کی بنیاد قائم ہے گویا یورپ کی سیاسی دلچسپیوں
نے تو صرف ایک میکاڈولی کو پیدا کیا تھا، لیکن مسلمانوں میں "میکاڈولی" سے
پہلے بہت پہلے "میکاڈولیوں" کا ایک گروہ ہی پیدا ہو گیا تھا اور اپنے خیال
کی توثیق و تصدیق میں وہ قرآنی آیات پیش کیا کرتا تھا، اور ٹھیک ان
ہی لوگوں کے مقابلہ میں جن کے نزدیک سیاست کے سوا اسلام گویا اور کچھ
نہ تھا ان ہی کے توڑ پر مسلمانوں ہی میں دوسرا طبقہ بھی نکل پڑا تھا۔ جن کا
خیال تھا۔

لا یجب نصب الامام — امام (حاکم حکومت) کے قائم کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔
اصلاً۔

دوسرا فرقہ جو سرے سے حکومت کی ضرورت کا منکر تھا

میر سید شریف جرجانی نے اس طبقہ کے اسی سیاسی نظریہ کا تذکرہ کر کے شرح مواقف میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ اپنے خیال کی تائید میں منجملہ اور باتوں کے وہ کہا کرتے تھے کہ :۔

"کیا حق ہے کہ اپنے ہی جیسے آدمی کو آدمی پر حکمران بنا دیا جائے اور خواہ مخواہ سمجھ میں آنے یا نہ آئے۔ . . . ہم کیوں مجبور کئے جائیں کہ دوسرے کے حکم کو مانیں۔"

حل اشکال [illegible] کو بیان نہیں کیا جس سے دشواریاں حل ہو جاتیں۔

گویا ان کا خیال تھا کہ عرب کے باشندوں نے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اپنے باپ دادوں کے دین کو چھوڑ دیا تھا، اپنی جان، اپنا مال سب آپ پر قربان کر رہے تھے تو کوئی وجہ نہ تھی اگر اپنے بعد مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کی صورت میں جو کچھ حکم دے دیتے لوگ اس سے سرتابی کرتے لیکن گونگو میں قصے کو رکھ کر جب؛ بیانوں کا یہ گروہ کہتا تھا کہ خود پیغمبر ہی کی طرف سے والعیاذ باللہ، کوتاہی ہوئی۔ بہرحال "حکومت ہی سب کچھ ہے" اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب کی حیثیت صرف وسائل اور ذرائع کی ہے۔ اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر ان میں بطور فیصلہ کے یہ مانا جاتا تھا کہ جس وقت جس قسم کی بات سے کام نکلنے کی توقع ہو اس کو ترک نہ کرنا چاہیئے۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ بڑے توقعات اپنے ماننے والوں کو دلاتے اور باور کراتے کہ ہمیں اس قسم کے فتوحات کی بشارتیں ملی ہیں۔ لیکن جب ان کا ظہور نہ ہوتا تو کہہ دیا کرتے کہ:۔

"خدا نے اپنا فیصلہ بدل دیا"

یا کہتے کہ:۔

"اب خدا کی مصلحت بدل گئی"

یا اس کا ارادہ بدل گیا۔"

اسی نظریہ کی تعبیر وہ "مسئلہ بدا" سے کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی غلط بیانی مذہباً و دیناً جائز بلکہ شرعاً واجب اور ضروری ہے۔ "تقیہ" اسی نظریہ کی اجمالی تعبیر ہے۔

تیسرا نظریہ قائم کیا گیا۔ شہرستانی نے لکھا ہے۔

"حکومت کی ضرورت حق تعالیٰ کی معرفت اور توحید کے لئے ضروری نہیں ہے"

اور اتفاف لیہ مذہب نے یہ طے کر دیا تھا جیسا کہ علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ:۔

"قیام حکومت کی نوعیت مسلمانوں کے ان فرائض کی ہے جن کو فرض کفایہ کہتے ہیں۔ یعنی ہر ہر مسلمان سے انفرادی مطالبہ اس کا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اجتماعی طور پر چاہیئے کہ اس کام کو وہ پورا کریں" (شرح مقاصد ص ۲۷۱)

علامہ تفتازانی نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"قیام حکومت چونکہ ایک عملی کاروبار ہے اس لئے عقائد سے اس مسئلہ کا تعلق نہیں ہے بلکہ فقہی احکام کے ذیل میں اس کو شمار کرنا چاہیئے"

بہرحال اتنی بات تسلیم کر لی گئی کہ:۔

"حدود اور سزاؤں کے لئے یا حقوق کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے اور یتیموں اور بیواؤں کی نگرانی کے لئے اللہ کے کلمہ کو بلند رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ:۔

اپنی تائید میں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ :-

"حکومت جب بھی قائم ہوگی بعضوں کے اغراض کے مطابق نہ ہوگی، خواہ مخواہ یہی لوگ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں گے پھر بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے"

وہ اس مشابہت کو بھی پیش کرتے تھے کہ :-

"بادیہ یعنی صحرائی علاقوں کے باشندے کسی قسم کی حکومت کی تنظیم کے بغیر ابتدا سے نامعلوم زمانے سے زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں اور اپنے معاملات و اغراض کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس قسم کا تعلق رکھتے ہیں کہ کوئی کسی پر زیادتی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا"

شرح مواقف مرصد رابع ص ۳۲۳ مطبوعہ قسطنطنیہ الجرجانی ہی نے لکھا ہے کہ ان ہی میں بعض کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ "امن کے زمانہ میں حکومت کی ضرورت نہیں البتہ ملک میں جب فساد و فتنہ پھوٹ پڑے تو اس کو دبانے کے لیے وقتی طور پر کسی قسم کی حکومت قائم کرلینی چاہیئے۔ مقابلہ میں دوسرا گروہ کہتا تھا کہ نہیں امن ہی کے زمانہ میں تو حکومت کی ضرورت ہے کہ اس وقت لوگ آئینی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ لیکن فتنہ و فساد میں تو ہر ایک اپنے خیال میں مست ہو جاتا ہے اس وقت حکومت قائم کرنے سے بجز نقصان کے اور کسی فائدہ کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔

بہر حال افراط و تفریط کے ان دونوں سیاسی نظریوں کے درمیان

"اختلافات اور جھگڑوں کے مٹانے ہی کے لئے تو پیغمبر آتے تھے۔ ان کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ بکھرے لوگوں کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کر دیں۔"

اسی لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ اسلام کی اسی "جوہری روح" کو ابہام و تذبذب کے حال میں چھوڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لیجاتے۔

حکمرانی کے استحقاق کے متعلق مختلف نظریات

مگر جب یہ سوال آتا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فیصلہ کیا تھا تو جواب میں اختلافات کا طوفان برپا ہو گیا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ شخصی نامزدگی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو گئی تھی یعنی مسلمانوں کی حکمرانی کی باگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن صاحب کے ہاتھ میں لیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فیصلہ کر کے تشریف لے گئے۔ دوسرا گروہ مدعی ہوا کہ شخص تو نہیں البتہ "قبیلہ" کو آپ نے متعین کر دیا تھا کہ میرے بعد عرب کے فلاں قبیلہ والے سیاسی قیادت کا فرض مسلمانوں میں انجام دیں۔

کون سا قبیلہ؟ اس میں قریش۔ ہاشمی خاندان۔ عباسی خاندان۔ سادات خاندان سب ہی کے نام پیش ہوتے رہے۔

اسی سلسلہ میں بعضوں کا خیال تھا کہ صرف عبدالمطلب کی اولاد مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی ساری اولاد کو حکومت کا دینی حق ان لوگوں کے نزدیک حاصل تھا حتیٰ

ولا یکون الامر فوضی بین العامۃ۔
صفحہ ۱۶ شہرستانی ج ۲

حکومت کا قائم ہونا ناگزیر ہے۔ تاکہ قوم میں منتشر اور غیر منظم ہوکر مسلمانوں کی زندگی تتر بتر نہ ہو جائے۔

یہ اور اسی قسم کے خیالات کو پیش کر کر کے چاہا گیا کہ سیاست کے مسئلہ میں غلو سے مسلمانوں کے جو جذبات کام لے رہے ہیں۔ ان کو اعتدال کے نقطہ تک کھینچ کر لایا جائے اور مسلمانوں کی اکثریت نے اسی خیال کو تسلیم بھی کرلیا۔ لیکن "سیاست" ہی اسلام کا سب کچھ ہے" اس پر اصرار کرنے والوں کا اصرار بہرحال باقی ہی رہا۔ ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا تھا کہ اسلام کا جو سب کچھ تھا" اسی کو غیر منفصل حال پر چھوڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے کیسے تشریف لے جا سکتے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی قطعی فیصلہ جیسا کہ ان لوگوں کا دل چاہتا تھا، کیا یا نہ کیا۔ لیکن کسی طرح یہ مشہور ہی کردیا گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعی فیصلہ کردیا تھا۔ شہرستانی نے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے:-

"ہو نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں ہی مسلمانوں کو شتر بے مہار بے سروں کی فوج کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے جاتے اور ہر مسلمان کے لئے موقعہ اس کا چھوڑ دیتے کہ جس کے جی میں آئے وہ اس مسئلہ میں رائے قائم کرے اور ہر ایک اپنی راہ پر چلا جائے۔"

اُن کا بیان تھا کہ:-

عنوان بنتے تھے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرکز بنا کر دیا تھا اور ان کی
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات مبارک سے تھی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ علی کی
حکومت قائم ہوتے ہی ساتھ ہی دنیا ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو جائے گی۔
اور انصاف و عدل سے بھر جائے گی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حکومت قائم
ہوئی اور جیسا کہ معلوم ہے آپ کا سارا عہد خلافت فتنہ و فساد اور خانہ جنگی میں
ہی گذر گیا اور آپ کے بعد جو کچھ ہوا وہ ان لوگوں کے منشا کے مطابق نہ تھا
اس لئے ایک گروہ ان میں کھڑا ہو گیا جس نے سرے سے حضرت علی کی شہادت
اور وفات ہی کا انکار کر دیا۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ انہی کے گروہ کا شیخ ابن سبا
کہا کرتا تھا کہ :-

" ستر دفعہ بھی علی کا بھیجا اور دماغ میرے سامنے لایا جائے
جب بھی میں ان کی موت کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ وہ وقت
زندہ رہیں گے جب تک کہ دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر
نہ دیں جیسے وہ جور و ظلمت سے بھر گئی ہے۔ " ابن حزم

انہی لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
بادلوں میں رہتے ہیں۔

اور بادل ہی سے آواز دیتے ہیں کہ فلاں میرے نام لیوا کا لوگ ساتھ دیں۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زندہ رہنے کا نظریہ جب ایک دفعہ گھڑ لیا گیا
تو پھر اسے پھیلتے دیر کیا لگتی تھی۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں جس کی طرف بھی امامت منسوب

نے معتصم عباسی کے عہد میں طالقان کو مرکز بنا کر خروج کیا تھا اور بارہ مشہور اماموں میں حضرت موسیٰ کاظم امام جعفر صادق ان کے صاحبزادے اسماعیل بن جعفر سب ہی کے متعلق ابن حزم نے لکھا ہے کہ ماننے والوں کا یہی خیال ہے کہ وہ زندہ ہیں اور جب تک دنیا کو عدل و انصاف سے نہ بھر دیں گے، زندہ رہیں گے،

الغرض شخصی نامزدگی کے سیاسی اصول کو مان کر مختلف بزرگوں کو مختلف زمانوں میں لوگ حکمرانی کے لئے جو اٹھاتے رہے اور جو امیدیں باندھنے والوں نے ان کی ذات کے ساتھ خواہ مخواہ باندھ رکھی تھیں، جب وہ پوری نہ ہوئیں تو حیات جاوید یا امر ہونے کا نظریہ انھوں نے پیدا کر لیا، اسی شخصی نامزدگی ہی کی پیداواروں میں سے غالباً ایک خیال وہ بھی ہے جس کا ذکر ابن حزم نے تفصیل سے کیا ہے یعنی بارہ اماموں کے نظریہ والوں کے نزدیک ایک شخص سے دوسرے شخص تک منصب کا انتقال منتقل ہوتے ہوئے جب حضرت حسن عسکری گیارھویں امام تک نوبت پہنچی تو جیسا کہ ابن حزم اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ بظاہر آپ کے بعد کوئی اولاد آپ کی دنیا میں باقی نہ تھی لیکن آپ کے ماننے والوں میں سے ؎

؎ عجیب بات ہے کہ حسینی سادات ہی کے ایک بزرگ خانوادہ میں سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سکھوں سے مقابلہ میں جہاد کی مہم پنجاب میں جو انجام دی اور بعض سرحدی پٹھانوں کی بے وفائی آپ کی شہادت کی وجہ ہوئی آپ کے متعلق بھی آپ کے بعض معتقدوں میں سے بعضوں کا زمانہ تک یہی خیال رہا کہ وہ زندہ ہیں اور واپس آ کر پھر اپنی مہم کی تکمیل فرمائیں گے۔ ۱۲

کی گئی لیکن واقعی دنیا کی حکومت ان کو حاصل نہ ہو سکی تو یہی صورت ہیں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسی دعویٰ کا اعلان کیا گیا۔

حی لم یمت ولا یموت حتیٰ | وہ زندہ ہیں اور جب تک دنیا کو عدل و انصاف سے
یخرج فیملاء الارض عدلاً کما | نہ بھر دیں گے جیسے وہ ظلم سے بھر گئی ہے
ملئت جورا۔ | اس وقت تک وہ مر بھی نہیں سکتے۔

ابن حزم نے اس سلسلہ میں نام گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کے نام سے جو مشہور ہیں اور مشہور سیاسی لیڈر مختار ثقفی آپ ہی کے اسم مبارک سے ناجائز نفع اٹھانے کی کوشش کرتا رہا، ان کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ :۔

" محمد بن حنفیہ رضوی نامی پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں ان کے داہنے جانب شیر اور بائیں جانب میں ہمیشہ ایک چیتا آپ کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ فرشتے آپ سے باتیں کرتے ہیں اور صبح و شام غیب سے آپ کے سامنے آسمانی خوان نازل ہوتا رہتا ہے اور دو چشمے ایک پانی کا اور ایک شہد کا اسی پہاڑ میں آپ کے لئے ابلتا ہے۔ مشہور تانی صفحہ ۱۸"

اسی طرح حسنی سادات میں سے محمد جو نفس زکیہ کے نام سے مشہور ہیں ان کو بھی معتقدین کا ایک گروہ زندہ جاوید سمجھتا ہے۔ حالانکہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں وہ مدینہ میں شہید ہو چکے تھے۔ اسی فہرست میں یحییٰ بن عمر جو زید علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور اسی گھرانے کے ایک بزرگ محمد بن قاسم جنہوں

بہرحال شخصی نامزدگی کے نظریہ والوں میں جیسا کہ آپ سن چکے ہیں۔ تقریباً ہر اس شخص کے متعلق جن کے نامزد ہونے کا دعویٰ کیا گیا - اُن کی وفات کے بعد بھی لوگ اُن کو زندہ ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن اوروں کے متعلق تو یہ تدریجاً یہ خیال مضمحل ہوتے ہوئے تقریباً کچھ فراموش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴

نا بیان تھا کہ یہ بچہ میرے سامنے پیدا ہوا۔ قابلہ کا کام میں نے ہی انجام دیا تھا۔ بیان کرتی تھیں کہ یہ پیٹ سے نکل کر بچہ جوں ہی میرے ہاتھ میں آیا تو دیکھا کہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے ص ۱۲۰ ج ۳۔ دوسری جگہ اسی کتاب میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ سیدنا حسن عسکری کی شرعی کنیز زن کا نام نرگس یا صیقل یا سوسن بتایا جاتا ہے بیس سال تک امام حسن عسکری کی وفات کے بعد عباسی حکومت کے ایک شخص حسن بن جعفر نوبختی نوبختی کے مکان میں یہ زن محروسہ رہی۔ عباسی خلیفہ معتمد سے لوگوں نے شکایت کی کہ جو بڑے شرم کی بات ہے آخر بیس سال کے بعد معتضد کے حکم سے یہی عورت قصر خلافت میں بلا لی گئی اور وفات تک اسی شاہی قصر میں رہی وفات اس کی معتضد باللہ کے زمانہ میں ہوئی۔ ابن حزم نے لکھا ہے سنہ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکری کی وفات ہوئی اس وقت سے ان کے صاحبزادے کے خروج کا انتظار بارہ اماموں کے ماننے والے کر رہے ہیں۔ ان ہی کو "المہدی المنتظر" کہتے ہیں گویا ایک ہزار سال سے زیادہ مدت انتظار ہی میں گزر رہی ہے۔ خود اپنا خیال ابن حزم کا یہ ہے کہ فسو یعقب الحسن المذکور لاذکرا ولا انثی ص ۱۲۰ ج ۳ - یعنی امام حسن عسکری نے اپنے بعد نہ کوئی لڑکا چھوڑا اور نہ لڑکی۔ الدراسات کے بعد شرعی کنیز کے اس بچہ کا قصہ یوں ہی گھڑ لیا گیا تھا۔ حکومت کا فیصلہ بھی یہی تھا اس لئے وراثت حسن عسکری کے بھائی جعفر کی ماں کو دلوائی گئی۔ ۱۲

"بعضوں نے تو مشہور کیا کہ ایک بیٹا آپ کا پیدا ہوا جسے دشمنوں کے خوف سے آپ نے چھپا دیا۔ اور بعض مدعی ہوئے کہ آپ کی شرعی کنیز حاملہ تھی اور وفات کے بعد وہ لڑکا جنی"

ابن حزم نے لکھا ہے کہ :-

"اس لونڈی کے نام میں بھی لوگوں کا اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ اس کا نام نرجس (نرگس) تھا اور کسی کا دعویٰ ہے کہ سوسن نام تھا عام خیال ہے کہ صیقل اس کا نام تھا"

ابن حزم ہی کا بیان ہے کہ :-

"اسی صیقل نامی کنیز نے آپ کی وفات کے بعد استقرار حمل کے دعوے کا اعلان کیا اور مقدمہ حکومت میں سات سال تک میراث کا چلتا رہا۔ امام حسن عسکری کے بھائی جن کا نام جعفر بن علی تھا، وہ اس کنیز کے دعویٰ کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے حکومت کے لوگوں میں کچھ لوگ جعفر کے ہمنوا اور مددگار تھے اور کچھ لوگ صیقل کی سرپرستی کر رہے تھے۔ لیکن آخر میں فیصلہ جعفر ہی کے دعویٰ کے مطابق ہوا"

ابن حزم نے اس سلسلہ میں بعض دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے۔[1]

---

[1] بیان کیا ہے کہ حسن عسکری کے ان صاحبزادے کے متعلق بعضوں کا خیال تھا کہ والد کی زندگی ہی میں پیدا ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بہت زمانہ کے بعد ولادت ہوئی اور اسی خاندان کی ایک خاتون جن کا نام حکیمہ تھا اور محمد بن علی رضا بن موسیٰ کاظم کی بیٹی تھیں ان کی روایت ...

اور سندھ تک کے اہل علم و فضل سے شروع کر کے مغربی افریقہ
کے دور دست علاقوں جن میں طنجہ اشبیلیہ و تمام سمندری
جزیروں اور شام و ارمینیہ جبال قبق اور اسبیجاب اور چینی
ترکستان ، فرغانہ اشروسنہ الغرض خراسان کے آخری
سرحد جو ژیان سے لے کر کابل تک درمیان میں جتنے شہر
جتنے قصبے اور دیہات ہیں ، کیا ان سب کے متعلق رائے
دریافت کرنے کی اس مہم میں کامیابی ہو سکتی ہے ۔

(ص ۹۲، ج ۴)

ابن حزم کے زمانہ یعنی پانچویں صدی ہجری میں اسلامی خلافت کا
جغرافیہ یہ تھا ۔

بہرحال اسی لئے بعض لوگوں نے دارالحکومت کے ارباب حل و عقد
تک انتخاب کے اس حق کو محدود رکھا ہے اس کے سوا بھی بہت سے
نظریے پیش کئے گئے لیکن جب تک سیاسی اقتدار کے مالک مسلمانوں میں
عرب رہے عربی قبائل ہی تک حکمرانی کے مسئلہ کو انہوں نے محدود رکھا اور
اکثریت کا رجحان یہی رہا کہ جب تک ممکن ہو ، قریش کے عربی قبیلہ ہی
سے امام کو انتخاب کرنا چاہیے ۔ علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا
ہے کہ علاوہ ان آثار و احادیث کے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قریش
ہی کو ترجیح دینے کا حکم دیا گیا تھا ، یوں بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ،،
نسب اور خاندانی شرافت کے متعلق عموماً دیکھا جاتا ہے

ہی سا ہو گیا ۔ صرف ان ہی بارھویں امام "مہدی منتظر" کے متعلق امامیہ فرقہ اب تک خروج کے انتظار میں ہے ۔ ہزار سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے لیکن انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی ہیں ۔ ان لوگوں کی طرف سے عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں میں عام طور پہ خضر اور الیاس نامی بزرگوں کو مانا جاتا ہے کہ ہزار ہا ہزار سال سے زندہ ہیں تو ان ہی کے ساتھ ایک اور ہستی کا اضافہ اگر ہو گیا تو لوگوں کو اعتراض کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ابن حزم نے ان کے اس عذر پہ بحث کی ہے جس کیلئے اصل کتاب کو پڑھنا چاہیئے ۔

باقی شخص نامزدگی کے اصول کے جو قائل نہ تھے اور حکومت کیلئے حکمران کے انتخاب کا حق ان کے نزدیک عام مسلمانوں کا حق ہے ان میں بھی اس سوال پہ کہ کیا یہ حق ہر ہر مسلمان کا ہے یعنی جب تک زندہ مسلمانوں میں سے ہر ایک کی رائے کا علم نہ حاصل ہو اس وقت تک انتخاب جائز نہیں ہو سکتا ، یا مسلمانوں کے کسی خاص طبقہ کے انتخاب سے انتخاب صحیح ہو جاتا ہے ۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے ہر ہر مسلمانوں کا رائے حق اس کو قرار دیا ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر ہر مسلمانوں تو بڑی بات ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کے ارباب علم و فضل کی رائے کا دریافت کرنا بھی آسان نہیں ہے ۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ :-

" ملتان اور منصورہ (سندھ) سے مہرہ (حضرموت)

کردوں میں خاص قسم کی غیر معمولی عظمت پائی جاتی ہے۔
اور مختلف خیالات اور پراگندہ افکار کو ایک نقطہ پر جمع
کرنے کے لئے عام طور پر نسبی شرافت موثر ذریعہ ثابت
ہوئی ہے"

علامہ نے آگے بیان کیا ہے کہ:۔
"قوموں کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ حکومت اور سیاسی اقتدار
عموماً کسی خاص خانوادے میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے اسی
لئے ایک خاندان سے منتقل ہو کر حکومت کسی دوسرے خاندان
والوں کے ہاتھوں میں جب چلی جاتی ہے تو تاریخ کا ایک
اسے غیر معمولی حادثہ اور واقعہ قرار دیا جاتا ہے"
اپنے تمہیدی بیان کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ:۔
"نظر بوجوہ بالا قریش کو دیکھا جائے تو مسلمانوں میں ہمیشہ عزت
و وقار کے مالک وہی لوگ رہے ہیں۔ رسالت بھی اسی قبیلہ
پر ختم ہوئی اور قیامت تک باقی رہنے والا دین دنیا والوں
کو قریش ہی کے ذریعہ ملا۔
اور یوں قریش ہی کو حکمرانی کا باز مقدار شرعاً و عقلاً لوگ سمجھتے رہے
لیکن جوں جوں عربوں کی سیاسی قوت اضمحلال کی شکار ہوتی چلی گئی اور
غیر عربی نسلوں کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل ہونے لگا تو ان کی طرف سے
یہ کوشش ہونے لگی کہ قریش کی اس تخصیص داری کو ختم کیا جائے۔ اس مد

حکومت جس کا اساسی مقصد ہی یہ ہے کہ ظلم و جور اور بے انصافی کا ازالہ کرے اس کے برعکس جور و ظلم کے بڑھانے میں ایسی حکومت مددگار بن جائے گی۔ اسی مقصد کو بنیاد بنا کر ان لوگوں کی طرف سے سیاسی نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ عربوں کے مقابلہ میں غیر عربی مسلمان ہی اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ حکومت کی قوت ان ہی کے ہاتھ سپرد کر دی جائے تاکہ وہ کمزوروں اور ضعیفوں کی پشت پناہی کر سکیں مسلمانوں کے ایک فرقہ ضراریہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے سیاسی نظریہ کا ذکر ان الفاظ میں شہرستانی نے جو کیا ہے کہ:

حکومت کا استحقاق غیر قریشیوں کو بھی ہے تاآنکہ اگر ایک قرشی اور ایک نبطی یعنی غیر عربی مسلمان حکومت کے امیدوار بن کر کھڑے ہوں تو ہم نبطی یعنی غیر عربی ہی کو ترجیح دیں گے کیونکہ غیر عربی اقلیت میں ہیں اور ذرائع بھی ان کے کمزور ہیں۔	ان الامامة تصلح فی غیر قریش حتی اذا اجتمع قرشی و نبطی قدمنا النبطی اذ هو اقل عددا و اضعف وسیلة۔ ص ۶۳ ج ۱ شہرستانی

اس سیاسی نظریے والے یہ بھی کہتے تھے کہ غلط کاری کی صورت میں اقلیت والوں سے چھینے ہوئے اس حکمران قوت کے ہٹانے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت ہی کے سپرد حکومت کا اقتدار کیا جائے اس کی ایک بڑی مصلحت یہ بھی جو شہرستانی نے ان کا یہ قول یعنی فیمکن خلعه و جس جماعت کے لئے اس اقلیت والے

لان بقیتہ محوطۃ بالامام ضرورۃ ۔
مسلہ شرح مقاصد

اور ملت کی بقا کے لئے امام کی ضرورت ہے وقت کی اسی حاکم کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے ۔

بہرحال عرب کے سیاسی اقتدار کے خاتمے کے بعد مجبوراً مسلمانوں کو قریش کے متعلق اپنے سیاسی نظریہ میں ترمیم کرنی پڑی۔ شروع میں غیر عربی مسلمانوں کی طرف سے جب مطالبہ اقتدار کا پیش ہوا تو اس سلسلہ میں جہاں بہت سے دلائل شرعی و عقلی پیش ہوتے رہے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سیاسی نظریہ تھا جس کی طرف شاید ہی اس وقت تک کسی کا ذہن منتقل ہوا ہوگا۔

حکومت کے اقتدار
کی مستحق ملک کی کمزور پارٹی ہے

مطلب یہ ہے کہ قریش اپنی وجاہت اپنی تاریخی عظمت اپنی شوکت و قوت کو اپنے استحقاق کے جواز کے سلسلے میں پیش کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں بعضوں نے یہ عجیب سیاسی نکتہ پیش کیا کہ جن لوگوں کو کسی وجہ سے تمام لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں یا تعداد کی وجہ سے غالب ہیں اور عنصر ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان ہی کے ہاتھ میں حکومت کے اقتدار کو بھی سپرد کرنے کے یہ مستحق ہوں گے کہ ملک کے کمزور عناصر اور بے پناہ باشندوں کے ساتھ ان کے جی میں جو کچھ آئے گا کر سکیں گے ۔ اور

حکومت کی بنیاد جس پر ہے ان ہی کے ہاتھ میں کلی باقی ہے۔ تو پھر کچھ وہ
کہتے ہیں ان کا نقطۂ موجودہ عہد کی جمہوری حکومت میں ہر جگہ کہا جا
سکتا ہے، خواہ وہ مسلمانوں کی جمہوری حکومت ہو یا غیر مسلم اقوام کی۔ اس
باب میں سب کا حال یہ ہے۔ اور جمہوری حکومت کی بنیاد جس اصول پر
قائم ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

خیر میں کس قصہ میں الجھ گیا عرض کر رہا تھا کہ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں
کا افسانہ جو سنایا جاتا ہے اگرچہ یہ افسانہ افسانہ ہو چکا ہے۔ لیکن سنانے
والے اس کو کچھ اس طرح سناتے ہیں کہ ابھی یہ فرقے باقی ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں اختلاف کی ابتدا سیاسی قصوں
سے ہوئی، جیسا بتایا جاتا ہے عرب مسلمان جو سیاست کے میدان ہی سے تقریباً
نکل چکے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا سیاسی نظریات کے اختلافات کے
ذکر کرنے والوں کے رہ جانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا کی سیاست
کے موثر عنصر جب تک مسلمان تھے واقعہ تو یہ ہے کہ اسی زمانہ میں رفتہ
رفتہ یہ سارے سیاسی فرقے ختم ہو چکے تھے سوائے کہ اہل سنت والجماعت
یا سنیوں کے مقابلہ میں اسماعیلی یا شیعوں کا ایک فرقہ رہ گیا۔ جو پرانے
جھگڑوں کے ذکر کو سال کے خاص مہینوں میں یاد کر کے پھر بھول جاتا
ہے اور ہے بھی جو کچھ تو زیادہ تر مسلمانوں میں سیاسی فرقے اس "شیعہ
طبقہ" ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ:

قال بعضهم ان نبينا وسيفي   بعضوں کا قول ہے کہ ...

حکمراں کو ہٹانا ممکن ہوگا، جو نقل کیا ہے بظاہر اس کا یہی مطلب ہے۔ میں
نہیں جانتا کہ حکومت کے سلسلے میں اقلیت کی ترجیح کا نظریہ سیاست
کی دنیا میں کبھی پیش ہوا ہو لیکن جو دلائل اور وجوہ ان کی طرف سے پیش
کئے گئے ہیں۔ وہ مستحق توجہ معلوم ہوتے ہیں اور واقعی اگر اکثریت کے
ساتھ حکومت کے فرائض میں "اقلیت" کی حفاظت بھی ہے تو یقیناً یہ
سوچنے کی بات ہے اکثریت تو اپنی تعداد کی کثرت کی وجہ سے بذاتِ خود
طاقت ور ہوتی ہے لیکن غریب "اقلیت" کیا کرے آخر اس کی حفاظت
کی کوئی صورت تو انسانی ضمیر کو نکالنی چاہیئے۔

جمہوریت کے اس عہد میں بھی غریب "اقلیت" کے مصائب اور پریشانیوں
کا کوئی حل نہیں نکل سکا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کے زمانہ میں
"اقلیت" غریب کی مظلومیت اپنے آخری حدود کو پہنچ گئی ہے۔ اور
حکومت کے اس گذرے ہوئے دور کو جس کا غلط نام شخصی حکومت رکھ دیا
گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں کبھی کسی شخص واحد
نے دنیا پر کبھی حکومت نہیں کی ہے۔ عموماً بادشاہوں نے دانشمند وزیروں
اور دوسرے اعوان و انصار ہی کی مدد سے حکومت کی ہے، بہر حال نام کچھ
بھی رکھ دیا جائے لیکن جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے بادشاہوں کے
عہد میں بھی "اقلیت" کے حقوق اتنی لا پروائیوں کے ساتھ کبھی نہیں
کچلے گئے، جتنی بے دردی کے ساتھ آج جمہوری حکومتوں میں ان کو ٹھکرایا
جا رہا ہے۔ اکثریت والے پہلے ہی سے طاقت و قوت والے ہوتے ہیں اور

آ گئی تھی۔

اسلام کو مان کر اپنے آبائی پیشواؤں سے کوئی بچھڑتا نہیں ہے

اپنے بزرگوں اور تاریخی پیشواؤں سے بچھڑ جانے کا خطرہ خواہ مخواہ دلوں میں جو پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا ازالہ کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ لوگ الٹی بات سمجھ رہے ہیں قرآن کا مقصد تو یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کو اپنے اگلے باپ دادوں کے صحیح دین اور دھرم تک کھینچ کر پہنچا دے وہ توڑنے کے لئے نہیں بلکہ ہر قوم کو ان کے واقعی صالح سلف سے جوڑنے ہی کے لئے نازل ہوا ہے۔ بیعت کرنے والوں سے عہد لیا جاتا تھا کہ۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ	مانا اللہ کو فرشتوں کو اللہ کی کتابوں کو
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔	اللہ کے رسولوں کو

اور اس کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی قبول کرنی پڑے گی کہ۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ	ہم کسی قسم کی تفریق اور جدائی نہ کریں گے۔ اللہ کے
رُّسُلِهٖ	ان پیغام پہنچانے والوں کے متعلق۔

یعنی سب ہی کو مانیں گے اور یقین کریں گے کہ ان میں جس نے بھی پہنچایا ہے سچے کائنات کے خالق کا اور مالک پروردگار ہی کا پیغام پہنچایا، خواہ زمین کے کسی علاقہ میں آیا ہو اور انسانی نسلوں میں سے جس نسل میں بھی پایا گیا ہو۔ صرف اجمال ہی سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ سارے جہاں اور

ہوں کی وہ تصدیق کرتے ہیں۔

اسلامی پیغام کوئی نیا پیغام نہ تھا

یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں مسلسل اعلانات ہوتے رہتے تھے۔ مطلب سب کا یہی تھا کہ خالق کائنات کے سچے نمائندوں کے پیغام کے صادق اجزاء اور تمام عناصر پر تصدیق و توثیق کی مہر لگانے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمی رسالت کا پیغام دے کر اٹھایا گیا جب اپنے مخاطبوں کو خطاب کرکے مصدق لما معکم یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت یہ ہے کہ تم لوگوں کے پاس جو سچائیاں پہلے سے موجود ہیں ان کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ کے ساتھ ساتھ سورۂ فاتحہ کے بعد پہلی سورۂ بقرہ کی ابتداء ہی میں منجملہ دوسرے شرائط کے قرآن سے استفادہ کی ایک اہم شرط یہ بتائی گئی ہے کہ:

يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ — مانتے ہیں اس کو بھی جو تجھ پر اتارا اور اسے
وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ — بھی جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

نیا دھرم، نیا دین، نئی بات سمجھ کر بدکنے والے قرآن اور محمدی پیغام سے جو بدکتے اور بھڑکتے تھے ان کو سمجھایا گیا ہے کہ:

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ — کیا وہ بات کو سوچتے نہیں کیا ان کے پاس
أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ — کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے باپ دادوں
آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ — یعنی اگلی پشتوں کے باپ دادا کے پاس:

کو مخاطب بنانے کے لیے خطاب کی ابتدا رخاص وجوہ و اسباب کی بنا پر
جس علاقے کے باشندوں سے کی گئی۔[1]

—— یعنی عرب کے رہنے والے گذرے ہوئے پیغام بروں میں سے جن بزرگوں
کے کام یا کم از کم نام ہی سے ان میں جو مانوس تھے۔ ان کے ناموں کی تصریح
کر کرکے بار بار قرآن منادی کر رہا تھا کہ تمام بیرونی آلائشوں سے پاک و
صاف کر کے دین اور دھرم کی جو شکل الاسلام کے نام سے تمہارے سامنے
پیش ہو رہی ہے۔ یہ وہی دین ہے جس کی وصیت نوح کو ابراہیم کو موسیٰ
کو عیسیٰ کو کی گئی تھی، صحیح انجام تک پہنچنے کی سیدھی راہ انسانیت کے لئے
پہلے بھی یہی تھی، اب بھی یہی ہے، آئندہ بھی یہی رہے گی اسی صراط مستقیم
(سیدھی راہ) کی طرف بنی آدم کو بلانے والے خواہ کسی زمانہ میں آئے ہوں،
کہیں آئے ہوں۔ سب انسانی برادری ہی میں پیدا ہوئے تھے، ان میں
بعضوں کو بعضوں سے جدا کرنا، انسانی نسل کی وحدت کا انکار ہے۔ چند
مانوس ناموں کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے، کہ ان کے سوا اور بھی جو
دینی پیشوا رہنما کہیں گذرے ہیں۔

[1] یہی وجہ ہے اسی علاقہ کی زبان عربی میں قرآن نازل ہوا، مگر اسی کے ساتھ قرآن ہی میں کہہ
دیا گیا ہے کہ عربی [illegible] قصوریں کو سب [illegible] جانے والے بتاتے ہیں ورنہ بیان کی [illegible]
ہے جو ان [illegible] یہ کتاب ہدایت و شفا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ ءاعجمی وعربی قل
ھو للذین آمنوا ھدی وشفاء (تم سمجھو) یعنی عربی یا غیر عربی، کہہ دو کہ ایمان سے ان لیا
ان کے لیے یہ کتاب ہدایت ہے اور دوسروں کے [illegible] ہے۔

قریب تھے اس نے سیاسی خطرات اور اندیشوں کی پروا کئے بغیر اس قانون کو باقی رکھا گیا۔ اور وہ آج تک باقی ہے۔ اور یہی ایک دروازہ نہیں کھان پان میں بھی مسلمانوں کو قرآن نے اہل کتاب سے اور اہل کتاب کو مسلمانوں سے قریب رکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ بھی اسی نصب العین ہی کا اقتضاء ہے۔[1]

یہود و نصاریٰ کے سوا دوسری دینی قوموں کے ساتھ صحابہؓ کا طرزِ عمل

بلکہ قرآن جن لوگوں میں نازل ہو رہا تھا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست قرآنی نصب العین کے سمجھنے کا موقع جنہیں ملا تھا، میری مراد حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ہے، عرب سے باہر نکلنے کے بعد ان کے سامنے جب ایسی قومیں آئیں جن کی دینی تاریخ ماضی سے

[1] یہ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن کو نہ ماننا تو ظاہر ہے ان چیزوں سے تھے یعنی مسلمان ان کو تو قرآن اپنے حکم کا مکلف بنا سکتا تھا لیکن کھان پان کے متعلق جو قانون کے الفاظ ہیں کہ طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ ۔ یعنی جنہیں کتاب دی گئی ان کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے اس میں دوسرا جزو (یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے) یہی غور طلب ہے قرآن کو اہل کتاب اللہ کی کتاب ہی جب نہیں مانتے تو ان کو اجازت دینے کی غرض کیا ہو سکتی ہے منجملہ دوسرے وجوہ کے یہ بات بھی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ مسلمانوں کو جیسے قرآن اہل کتاب سے قریب کرنا چاہتا ہے اسی طرح اہل کتاب کو بھی مسلمانوں سے قریب کرنے کے لئے یہی پیرایہ تعبیر اس نے اختیار کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ان تک پہنچا لی تھی۔ فرسودہ تاریخ رکھنے والی قوموں کے مقابلہ میں ان عیسائیوں اور یہودیوں کے دین کی تاریخ زیادہ صحت مند تھی جہاں تک میرا خیال ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانے والوں کے لئے ان دونوں دینی امتوں سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا دروازہ یہ حکم دے کر کھول دیا گیا کہ ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں خواہ اپنے دین کی تصحیح و تکمیل کے لئے قرآنی ہدایات پر ایمان لانے کی سعادت سے یہ کتابی عورتیں محروم ہی کیوں نہ ہوں۔

مصلحت اندیشیوں پر اسلامی دین کی بنیاد اگر قائم ہوتی تو رشتہ داری کے اس دروازے کے کھلے رکھنے کی خود سوچنا چاہیے کیا گنجائش پیدا ہو سکتی تھی مسلمانوں کے گھروں میں ان دینی اقوام کی عورتوں کے گھسنے کی اجازت میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قطعاً غیر دانشمندانہ فعل ہوتا اگر اسلام بجائے دین کے صرف سیاسی کاروبار کے انجام دینے کا خدانخواستہ کوئی حیلہ اور بہانہ ہوتا سیاسی کشمکش ان دینی قوموں سے نزول قرآن ہی کے عہد میں حالانکہ شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی پروا کئے بغیر دینی مناسبتوں پر جو اجازت دی گئی تھی۔ اس اجازت میں کسی قسم کی ترمیم پر قرآن آمادہ نہ ہوا کہ اس کے سامنے صرف دین تھا۔ توثیق و تصحیح اور قدرت تکمیل کے نصب العین کو دنیا کے سارے مذاہب والوں کے سامنے قرآن نے جو رکھا تھا۔ اس نصب العین سے استفادہ کی صلاحیت اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے دین میں چونکہ واقعہ کے لحاظ سے زیادہ پائی جاتی تھی۔ دوسروں کے لحاظ سے وہ زیادہ

دھندلکوں میں تقریباً غائب ہو چکی تھی کیونکہ مزعوم اہل کتاب کے دین کی تروتازگی کی کیفیت ان میں باقی نہ رہی تھی، تاہم آثار قرآن بتاتے تھے کہ آسمانی کتابوں سے وہ بھی مانوس ہیں، تو جس حد تک تاریخی نشانات اور آثار کا اقتضاء تھا، یا ہو سکتا تھا۔ ———

——— صحابہ کرام نے تاریخ کی ان شہادتوں سے لاپرواہی نہیں برتی۔ پھر ان کے مجوسیوں کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کو متعین کرتے ہوئے اسی تاریخی آثار کا حوالہ دیا، فرمایا گیا تھا کہ ان کے پاس بھی صحیح دین اور آسمانی کتاب تھی، وسعت پذیر زمانہ نے گو ان کی دینی زندگی میں بہت سی آلائشوں کو شریک کر دیا ہے لیکن ان کا حال ان جنگلی قوموں کا نہیں ہے، جو جنگلوں میں حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور کسی قسم کے آئین و دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہئے، مجوس ہی نہیں بلکہ عام فقہاء اسلام نے ہنود تک کو ذمی معاہد کر کے اسلامی حکومت کی حفاظت کے دائرے میں شریک ہونے کے لئے [illegible] اور مسلمانوں کے عہد [illegible] سے ان کی جان اور مال عزت و آبرو کی ذمہ دار بن جاتی ہے تقریباً اسی رعایت میں ان سارے قوموں کو داخل کیا ہے جو ایسے ہیں مجوسیوں اور یہودیوں کی طرح کسی مذہبی روایت کی تاریخ رکھتی تھیں اور گو جمہور فقہاء نے [illegible] فیصلہ کیا [illegible] حکومت ہی لیکن ابن شہاب نے تو مجوس کے متعلق ان سارے حقوق کو [illegible] جو اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اسلامی ریاست میں حاصل ہیں [illegible] بعض صحابہ کے طرز عمل کو بھی [illegible] پیش کیا ہے [illegible] حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی [illegible]

باقی صفحہ ۴۵ پر

ملامت -

لکھتے ہیں کہ جس انداز طریقہ سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ کا
ذکر کرتے تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث گرانی ہوا تھا۔
جس کی معافی بعد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی وقت مانگ لی تھی۔ عام
طور پر لوگوں نے اس روایت کو توڑ مروڑ کر دیا۔ عموماً اس کا چرچا بھی کرتے ہیں
حالانکہ سنداً جیسا کہ زوائد جمع الفوائد کے مصنف نے لکھی آخر میں تنبیہ کی ہے کہ
سند میں اس روایت کے ابو عامر القاسم بن محمد الاسدی راوی ہے جس کے متعلق
کچھ نہیں معلوم کہ کون ہے اور اس کی روایت کس حد تک قابل بھروسہ ہو
سکتی ہے علاوہ ازیں کون کہہ سکتا ہے ناگواری کا سبب کیا تھا۔ ایسی
کتاب جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہو کہ "فیہ ھدی و نور" - اس
میں راہ یابی اور روشنی ہے۔ اس کتاب کا کوئی حصہ تو قطعی باعث ناگواری
نہیں ہو سکتا ہو خیال کرتی زرارہ لگے اس آدمی کو جس سے تورات کا یہ حصہ
حضرت عمرؓ کو ملا تھا اس کو جانے کہنے کی وجہ سے برہمی کی صورت پیش
آئی ناقابل توجہ ہے۔ قرآن نے "دینی اخوت" کا دروازہ کتابیوں
اور مسلمانوں کے درمیان کھولا تھا وہی برہمی کی وجہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں
روایت میں حقیقت کا کچھ حصہ بھی اگر مان لیا جائے کہ شریک ہے۔ تو یہی
کہا جا سکتا ہے کہ جہاں مسلمانوں اور دنیا کی دوسری دینی قوموں کے
درمیان ان کے دین کے خصوصی حالات کی بنیاد پر اسلام دینی رشتہ اور
اخوت کا تعلق قائم کرنا چاہتا ہے وہیں پوری قوت کے ساتھ تطہیر و

کو سلامت کھول دیا۔ عہد صحابہ ہی سے اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور بعد کو بھی کھلا ہی رہا۔

اس راہ میں عملی شہادتوں کا جو ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ عہد نبوت میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ مسلمانوں کے میل جول کے جن واقعات کا سراغ دوسری روایتوں کے ضمن میں جو ملتا ہے، خود دربار رسالت میں ان دینی قوموں کے افراد کی آمد و رفت سوال و جواب دیانت جیسے ظرافت و طیبت کے جن قصوں کا صحابہ تذکرہ کیا کرتے تھے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان کے ہاں جس بے تکلفی کے ساتھ آتے جاتے تھے اگر ان سارے واقعات کو اور ان کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طرز عمل کو کوئی جمع کرنا چاہے تو ایک اچھی خاصی کتاب تو اس مواد سے بن سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ والی روایت تورات کے متعلق

اب لوگوں کو کیا کہیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ایک روایت جو نقل کی جاتی ہے کہ تورات کا کوئی حصہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنے لگے کہ:

اخذتها من اخ لي من بني زريق (مجمع الزوائد)

بنی زریق (یہودی قبائل) سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک بھائی سے مجھے یہ ٹکڑا ملا ہے

عبداللہ بن سلام کو قرآن کے ساتھ تورات کی اجازت دیدی گئی

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے یہ حکم دیا کہ:۔

اقرا ھذا لیلۃ وھذا لیلۃ ایک رات یہ پڑھو اور ایک رات وہ

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص)

عبداللہ بن عمروؓ صحابی اور تورات

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ اور ان کے بعد تابعین کے زمانہ میں بھی ارباب ذوق تطہیری نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس ارشاد نبوی سے اٹھاتے رہتے صحابیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خاص طور پر اس باب میں شہرت حاصل تھی۔ ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔

ایک تابعی کا ختم قرآن اور ختم تورات

کہ تابعین میں ابو الجلد الجونی ایک ثقہ بزرگ تھے جو ایک ہفتہ قرآن کی تلاوت میں اور چھ دن تورات کے مطالعہ میں گذارتے دونوں کتابوں

لے اس پر [illegible] تفصیلات دیکھئے۔

تزکیہ کے اصلاحی نصب العین کو بھی پہنچتا ہے کہ نگاہوں سے ہٹنے نہ پائے۔ کیونکہ اس کے بعد تو نزولِ قرآن کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ بیرونی آمیزشوں اور من مانی آلائشوں سے ادیان و مذاہب کو پاک کرنا، اور اپنے اپنے ابرار اولین کی صحیح تعلیم تک واپسی کا موقعہ ہر قوم کے لئے فراہم کرنا، یہی تو قرآن کے نزول کا سب سے بڑا مقصد ہے جس کی بلا پروائی اور اس جوہری نصب العین سے معمولی بے توجہی بھی فاحش اغلاط کی بنا رکھنے کی ضامن بن سکتی ہے۔

توراۃ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت

اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا ضرورت تھی کہ بھٹکنے سے بچنے خطرے کا شروع ہی میں انسداد کر دیا جاتے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کی تہ میں کچھ اسی قسم کے اسباب پوشیدہ نہ تھے۔ آخر ایک طرف جہاں اس روایت کا چرچا کیا جاتا ہے، وہیں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ جہاں اس کا اطمینان تھا کہ پڑھنے والے کے ہاتھ سے تطہیر و تزکیہ کا نقطۂ نظر کسی حال میں اوجھل نہ ہوگا، وہاں نہ صرف یہ کہ منع نہیں کیا گیا بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے یہ عرض کرنے پر کہ ایک رات توراۃ بھی پڑھ سکتا ہوں اور قرآن بھی؟

رِبِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَہُوۡدَ (المائدہ) دشمنی اور عداوت میں یہود کو پاؤ گے۔

لیکن گزشتہ ادیان و ملل کے ساتھ قرآن اور قرآنی تعلیم کا جو تاریخی رشتہ تھا، اس رشتہ کو توڑ لینے پر تو قرآن کیا آمادہ ہوتا وہ ان پرانے مذاہب کے ماننے والوں کے طرز عمل سے قطعاً بے پروا ہو کر اس رشتہ کو مضبوط اور استوار ہی کرتا چلا گیا اور اس سے یہی وہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ عقل مصلحت اندیشیوں کا قرآنی دعوت میں خدانخواستہ کچھ بھی دخل ہوتا تو عقل مشکل ہی سے اس عجیب و غریب طرز عمل کے باقی رکھنے کا مشورہ دے سکتی تھی۔ لیکن قرآن تو واقعات اور صرف حقائق کا شارح تھا۔

جس تاریخی رشتہ کا گزشتہ مذاہب و ادیان کے ساتھ وہ مدعی تھا۔ یہی عجیب واقعہ تھا تو اس واقعہ کے سوا آپ خود ہی سنیے آخر وہ ظاہر کیا کرتا۔

غیر مسلم اقوام خصوصاً اہل کتاب کے پیشواؤں کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل

سچ پوچھیے تو قرآنی تعلیم کے اسی پہلو کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان کو بھی گلے لگایا، جو ان سے قریب ہونے کے لیے آگے بڑھے اور ان سے بھی وہ نزدیک ہی رہنے پر اصرار کرتے رہے، جو ان سے بھاگتے اور بھڑکتے رہے۔ وہ مسلمانوں کی، مسلمانوں کے پیغمبر کی، مسلمانوں کی کتاب کی توہین کرتے رہتے، ٹھٹھے اڑاتے رہے، لیکن مسلمان اس کے جواب میں ان کے پیغمبروں پر سلام ہی بھیجتے رہتے، ان کی کتابوں کا احترام ہی کرتے رہتے، ابتداء

اعتزالی رواداریاں کیوں اور کیسے پیدا ہو گئیں؟

ممکن ہے کہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہوں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ سب جو کچھ بھی ہے نتیجہ ہے قرآن کے اسی نقطۂ نظر کا جو دینی قوموں کے متعلق مسلمانوں کے اندر اس نے پیدا کر دیا ہے غیر دینی دائروں میں بھی ان کی اس موروثی عادت کے آثار اگر پائے جاتے ہیں تو جس قوم کی تربیت مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات سے کی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کم از کم مجھے تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔

مسلمانوں کو چوکنا رہنے کا مشورہ

اس سلسلہ میں مسلمانوں پر جو ذمہ داری عائد ہو گئی ہے وہ حد سے زیادہ نازک ہے۔ بے احتیاطیاں افراط و تفریط میں لوگوں کو مبتلا کرتی

(بقیہ حاشیہ) سامنے عقلی اور ذہنی علوم و فنون، حتیٰ کہ شعر و ادب۔ آخر جس یورپ والوں تک مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچا ہے، مسلمانوں کے توسط کے بغیر کسی علم یا فن کی صحیح تاریخی توجیہ ناممکن ہے لیکن یورپ کے اہل علم و قلم کا یہ التزام معلوم ہوتا ہے کہ نقل سے بھی مسلمانوں اور ان کے خدمات کا ذکر ان کے زبان اور قلم پر آ ہی نہیں سکتا۔ ہزار سال کی طویل مدت سے پھلانگ مار کر ان میں ہر ایک یونان و روم پہنچ جاتا ہے اور سارے علوم و فنون کے شجرہ نسب کا سلسلہ قدیم علمی تاریخ کے ان ہی دو قوموں کے داؤں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر ہے عہد نو با جلوہ بازار تو از غبار سے پائے [illegible] است۔ سچ تو یہ ایک ہی شعر ہے لیکن مجلدات میں بھی یہ تاریخ سمٹ نہیں سکتی ان کے ان دو مصرعوں میں سب کچھ سمٹ گیا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ یہودیوں کا جو رویہ
آج تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے رہتے ہیں۔ لیکن یہودیوں
کے انبیاء اور پیشواؤں کو مسلمان علیہم السلام کی دعاؤں ہی کے ساتھ یاد کرتے
ہیں بلکہ داؤد و سلیمان جنہیں یہودی صرف اپنے سلاطین اور بادشاہوں میں
شمار کرتے ہیں لیکن علیہ السلام کے اضافہ کے بغیر ان کا نام بھی مسلمان نہیں
لیتے قرآن نے ان کو یہی سکھایا ہے اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ تو عرض کر
چکا ہوں، ان کا دینی رشتہ بہت زیادہ قوی ہے۔

یونانی فلاسفہ و اطباء کے ساتھ ان کا طرز عمل

یونان کے فلاسفہ سقراط و افلاطون ارسطو یا اطباء بقراط و جالینوس
جیسی غیر دینی شخصیتوں کے متعلق لوگوں کو حیرت ہوتی ہے جب مسلمانوں
کی عام کتابوں میں پاتے ہیں کہ ان کا ذکر بھی کافی احترامی الفاظ میں کیا
جاتا ہے خود ان کے نظریات ہی کو نہیں بلکہ جن نتائج تک یونانیوں کے
طریقہ فکر کی روشنی میں مسلمان پہنچے ہیں اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ بھی اس
طریقہ سے کرتے ہیں کہ گویا یونانی فلسفہ یا یونانی طب ہی کے مسائل ہیں۔
اچنبھا ہوتا ہے کہ باوجود استفادہ کے قوموں کی عام ذہنیت جہاں یہ ہے
کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو لوگ چاہتے ہیں کہ ان ہی کی طرف منسوب
ہو جائے[1]۔ وہاں مسلمانوں میں اس کے برعکس یہ احترامی فراخ چشمیاں اور

[1] [illegible] (باقی صفحہ آئندہ)

میں کچھ لوگ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ تطہیر و تزکیہ کے قرآنی نصب العین سے متعلق جس غیر معمولی بیداری اور حوصلہ کی ضرورت ہے اس سے ان میں کچھ لاپرواہی سی، ابن عباسؓ کو نظر آئی کہ پیدا ہو رہی ہے۔ اسی لیے انہوں نے قرآن کے اس نصب العین کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی کتابوں کا یہ جدید آخری ایڈیشن ہے اور نیا ایڈیشن ہے جو ہر قسم کی آمیزشوں سے قطعاً پاک ہے۔ برعکس اس کے اہل کتاب کی کتاب میں تغیر و تبدل سب کچھ ہو چکا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اپنے مشکوک و مشتبہ نسخوں کی تصحیح و تطہیر قرآن پر پیش کر کے وہ کر لیتا لیکن برعکس اس کے ان ہی مشکوک نسخوں سے بعض مسلمانوں نے قرآنی مضامین کو سمجھنا چاہا! یہ ایک بڑا خطرناک اقدام تھا بلکہ قلب موضوع کی صورت تھی، ابن عباسؓ نے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے اس معاملہ میں محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنگ و نسل وطن اور زبان کی نہیں بلکہ دینی اور مذہبی بنیادوں پر بٹی ہوئی قوموں کے لئے اسلام نے اپنے دروازے کھولے، اعلان کے ساتھ سب کو بلایا کہ خواہ کسی رنگ کا آدمی ہو، کسی نسل کا ہو، کہیں کا رہنے والا ہو، جو زبان بھی بولتا ہو اور کسی دین سے تعلق رکھتا ہو، یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی ہو، ان میں ہر ایک اسلام کی کتاب قرآن کو خدا کی کتاب مان کر اپنے اپنے آبائی دین کو ہر قسم کی غیر الٰہی آمیزشوں سے پاک کر کے اپنے پیدا کرنے والے کی خالص مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور جس نصب العین

فطرة الله التي فطر الناس عليها — اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے آدمی کو پیدا کیا
لا تبديل لخلق الله (سورۃ روم) — اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہے۔

میرے نزدیک سورۂ روم کی اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے۔

کچھ بھی ہو قرآنی دعوت کا یہ دلآویز پیرایہ اور اس کے پکار کی یہ دلکشی تھی ہی ایسی کہ لوگ کھنچتے چلے جاتے تھے اور مانتے جاتے تھے عرب کے۔ ابتدا تو ابتدا میں کچھ کشمکش کی شکلیں بھی پیش آئیں، نہیں، ناپہچاننے والے تشریح شدہ میں کچھ ہچکچاہٹ بھی رہی۔ زیادہ تر اسی کشمکش اور ہچکچاہٹ میں جہاں تک میرا خیال ہے عربوں کی جاہلیت کو تھا۔

اسلام اور متمدن اقوام

لیکن جوں ہی کہ اسلام عرب کے جاہلوں سے نکل کر متمدن اقوام اور شائستہ ملتوں کے درمیان پہنچا یہ واقعہ ہے کہ اس کے ماننے والوں نے اس کے ماننے اور تسلیم کر لینے میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ آج اگر یہ پوچھا جائے کہ سارا شام سارا مصر سارا ایران ترکستان اور اسی قسم کے ممالک کے باشندے اچانک کیسے مسلمان ہو گئے تو غیر ہی نہیں میرا تو خیال ہے کہ خود مسلمان جو اپنی مستقل قومی تاریخ رکھتے ہیں، وہ بھی اس سوال کا شاید کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے۔

پہلی صدی ہجری کے اندر اسلام قبول کرنیوالی قومیں

ہجری کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے

کی تکمیل کے لئے آدمی پیدا ہوا ہے اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں
میں جس کا مطلب یہی تھا اور یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لانے اور اسلام کے
قبول کرنے کے بعد بھی سب کا خالق اور خدا بھی وہی رہے گا، جو پہلے تھا
دین بھی سب کا وہی رہے گا۔ جو پہلے تھا یعنی اس قدرتی دستور العمل کی
پابندی کا مطالبہ نبیوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے پہلے کیا تھا۔ اب
بھی انسانیت کی نجات اسی قدرتی دستور العمل سے وابستہ ہوگی۔ الغرض
خدا بھی وہی خدا رہے گا۔ جو ہمیشہ سے تھا اور دین بھی صرف وہی دین رہے
گا جو ہمیشہ سے نسل آدم کا صحیح خدائی دین تھا بلکہ دین کے لانے والے یعنی
پیدا کرنے والے کی مرضی سے آگاہ کرنے کے لئے بندوں میں وقتاً فوقتاً جو آتے
رہے اور قوموں میں مذہبی پیشواؤں کی حیثیت سے جو مانے گئے اور مانے
جاتے ہیں ان کو اب بھی اسی طرح مانا جائے گا۔ جیسے پہلے مانا جاتا تھا
گویا قرآن پر ایمان لانے کے بعد اس کا ہر ماننے والا پھر وہی ہو جائے
جو پہلے تھا اور وہ سارے شکوک و شبہات جو مختلف تاریخی موثرات کے
زیر اثر مذاہب اور مذاہب کے تعلیمات کے متعلق پیدا ہو گئے تھے۔ ان
کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جیز تمدنی باتوں کے ساتھ غیر خدائی چیزیں شعوری
یا غیر شعوری طور پر انسانی زندگی کے تمدنی زندگی کے قدرتی دستور العمل
میں باہر سے جو شریک ہو گئی تھیں باہر کی ان آلودگیوں سے ہر ایک کا دین
پاک بھی ہو جائے گا اور جن حالات کے لحاظ سے دنیا میں جن آسانیوں کو
انسانی فطرت تلاش کر رہی ہے وہ بھی قرآن میں مل جائیں گی۔

متمدن اور تعلیم یافتہ تھی اسی قدر اسلامی پیغام کے قبول کرنے میں اس نے سبقت کی، اور کیوں نہ کرتی، شک کی جگہ یقین، مخلوط کی جگہ اپنے پیدا کرنے والے کی خالص مرضی اور خالص دین کو ڈھونڈھنے والے جب قرآن میں پا رہے تھے تو جو کچھ انہوں نے کیا، اس کے سوا آخر وہ کیا کرتے البتہ ناواقفیت کی وجہ سے جن بیچاروں کو اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جس دین کو وہ مان رہے ہیں، اس میں صحیح عناصر کے ساتھ غیر دینی عناصر بھی گھل مل گئے ہیں ان بیچاروں کو ضرور دشواری پیش آتی تھی، لیکن جو یہ سمجھے کہ دین اور دھرم کے نام سے جو چیز ان میں پائی جاتی ہے، یہ ان کے آباؤ اجداد کے دین کی صحیح شکل نہیں ہے اس واقعہ کا جتنا واضح علم جن قوموں میں تھا اسی حد تک قرآن میں اپنے درد کی دوا ان کو نظر آئی، قرآن ان کے لئے رحمت بن گیا گویا ان کے دل کی پکار کا وہ قدرتی جواب تھا اس کتاب پر ایمان لانے کے ساتھ ہی ان پر کھل گیا کہ جو کچھ کھو دیا گیا تھا وہ بھی ان کو مل گیا اور حالات نے جن نئی ضرورتوں کو جو پیدا کر دیا تھا ان کا حل بھی اس میں موجود تھا۔ قرآن کا یہی پوزیشن قوموں کے درمیان پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ آسمانی کتابوں کا وہ آخری ایڈیشن ہے اس دعویٰ کا یہی منطقی نتیجہ اور اقتضاء ہے۔ قدر و قیمت قرآنی دعوت کے اس پہلو کے مقابلہ ہی سے سمجھ میں آتی ہے کسی خاص نسل یا کسی خاص رنگ، یا خاص زبان یا خاص ملک کے باشندوں، یا خاص مذہب کے ماننے والوں کی حد تک اپنے خطاب کو قرآن اگر محدود

والوں میں بقول جرجی زیدان۔

معظم اهل ممالک التمدن فی	اس زمانہ کے متمدن ممالک کا بڑا حصہ ایسا
ذلک العصر وفیهم العرب	ہو گیا جس میں عرب بھی تھے اور ایرانی بھی
والفرس والاتراک والسریان و	ترکانی بھی تھے اور سریانی بھی نبطی بھی تھے
القبط والنبط والنوبیة و	اور قبطی بھی، سوڈانی بھی تھے، عربی کا بولنے
البربر وکانوا یتکلمون العربیة	والے بھی، پہلوی زبان والے بھی اور کردی
والفارسیة والبهلویة والکردیة	زبان والے بھی، قبطی زبان والے بھی اور
والارمینیة والقبطیة و	بربری بھی۔

البربریة وغیرها۔ (تاریخ التمدن الاسلامی ص ۲۰۱ ج ۲)

باہر سے قوموں کو فتح کر کے سیاسی اقتدار کے شکنجوں میں ان کو کس لینا یہ نہ اسلام کا امتیاز ہے[1] اور نہ کسی دین کی شایانِ شان یہ بات ہو سکتی ہے کہ مار مار کر لوگوں کو مال گذاری کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور سچ تو یہ ہے کہ جسمانی قوت یا اسلحہ کی برتری بھی ان لوگوں کو حاصل نہ تھی جن کے ہاتھوں پر ان قوموں نے اسلام کو قبول کیا۔ حیرت میں جو بات ڈال دیتی ہے وہ قوموں کا یہی اندرونی انقلاب ہے کہ جو قوم جتنی زیادہ

[1] آخر میں پوچھتا ہوں کہ فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے ایرانی، یونانی، رومانی حکومتوں کے سوا اسی زمانہ میں انگریزوں اور روسیوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے۔ کیا ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے فتح کئے ہوئے رقبوں کا کیا عجز ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ اسلام کا اگر یہی کمال تھا تو دین کمال کی حق دار دنیا کی بہت سی قومیں ہیں۔ ۱۲

سانحہ قوموں میں اس کتاب کو روشناس کرائیں، یہ ہو سکتا ہے ور ہو بھی چکا ہے کہ سابقہ آبائی مذہب سے قرآن چونکہ اپنے ماننے والوں کا رشتہ کلیتاً منقطع نہیں کرتا، اس لئے اسلام قبول کر لینے کے باوجود بعضوں میں اس مذہب کا کچھ بچا کھچا اثر رہ جاتا جن سے مذاہب و ادیان کو پاک کرنے کے لئے قرآن نازل ہوا ہے میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآنی نقطہ نظر کا تو نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس نقطہ نظر کے صحیح استعمال سے محرومی کا ثمرہ اسے سمجھنا چاہیئے مگر کیا کیجئے ہر چیز کو ٹھیک اپنے صحیح صحیح مقام پر رکھ کر استعمال کرنے کا سلیقہ ہر ایک میں نہیں ہوتا۔

قرآن کے صحیح نقطہ نظر کے استعمال میں غلطی

مسلمانوں میں فرقہ بندی کی دو بنیادوں میں ایک بنیاد تو سیاسی اختلافات والی تھی جس کا قصہ آپ سن چکے اور دوسری بڑی اہم بنیاد جس سے مسلمانوں میں مختلف فرقے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں پیدا ہوتے تھے اس کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے زیادہ تر اسی مسئلہ سے تھا کہ غیر مذاہب کے لوگ شروع شروع اسلام میں داخل ہوئے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے آبائی دین کے بعض زہریلے جراثیم کو اپنے اندر سے نکالنے میں جیسا کہ چاہیئے کامیاب نہ ہو سکے۔ بجائے تطہیر و تزکیہ کے ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اپنے پرانے خیالات کے مطابق قرآنی آیات کو کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل قلب موضوع تھا قول فیصل تو قرآن تھا، لیکن

رکھنا اور بجائے جوڑنے کے اعلان کرتا کہ ہر قوم کو ان کے موروثی پیشواؤں اور
آبائی ادیان سے توڑنے کے لیے وہ نازل ہوا ہے تو ماننے والوں نے جس طریقہ
سے اس کتاب کو مانا کیا یہ کامیابی اس کے سامنے آ سکتی تھی؟

اسلام کے پیش کرنے میں اصولی غلطی

افسوس ہے کہ پیش کرنے والوں ہی کی طرف سے دوسروں کی ریس
میں دیکھا جا رہا ہے۔ کچھ دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ بجائے تصدیق و
توثیق، تسلیم و تکمیل کے سابقہ مذاہب و ادیان اور ان کی تعلیمات، ان
کے پیشواؤں کی تحقیر و توہین کے اس طریقہ کو لوگ اختیار کر رہے ہیں۔
جو یورپ کے پادریوں کا طریقہ تھا۔

مذاہب کا تقابلی مطالعہ پادریوں کا دستور ہے

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے عنوان سے یورپ کے ان ہی پادریوں
نے مذاہب کی تحقیق و تفتیش کی یہ نئی راہ جو نکالی تھی افسوس ہے، کہ
مسلمانوں میں بھی یہی طریقہ حسن قبول حاصل کر رہا ہے حالانکہ ضرورت ہے۔
کہ قرآن نے خود اپنے آپ کو قوموں کے درمیان جس طریقہ سے رکھا ہے اور
ادیان و مذاہب کے سلسلہ میں اپنا طبعی مقام اس کتاب نے خود جو متعین
کر دیا ہے، اسی مقام پر اس کو رکھا جائے بلانے والوں کو چاہیے کہ اسی مقام
پر کھڑے ہو کر اس کتاب کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اسی نیازی رنگ کے

ان کو اندازہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر کیا انہوں نے یہی کہ قرآن ہی کو تابع بنا لیا اور جن عقائد و خیالات کے ماحول میں موروثی طور پر ان کی پرورش ہوئی تھی ان ہی کو اصل کی حیثیت سے استعمال کرتے رہے یہ خطرہ پہلے بھی پیش آیا ہے اور قرآنی نقطۂ نظر کا غلط استعمال ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس خطرے کو سامنے لائے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غیر فطری کاروبار زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسی غیر فطری کاروبار کے شکار ہو کر مسلمانوں میں بہت سے فرقے جن رنگوں کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے۔ ان کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ خدا نخواستہ اگر یہ خطرہ پیش بھی آیا تو انشاءاللہ اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلے کا ہو چکا ہے اور یہ مختصر الفاظ میں کچھ اسی اجمال کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی داستان کا مطالعہ اس تاریخی نکتہ کی روشنی میں نہیں کیا گیا۔ ہے ورنہ جتنے دردناک لہجوں میں اسلامی فرقوں اور ان کے انتشار پراگندگی کا مرثیہ سنایا جاتا ہے۔ شاید یہ کیفیت اس میں نہ پیدا ہوتی۔

اختلاف کی ابتدا مسئلہ تقدیر سے ہوئی

واقعہ یہ ہے کہ سیاسی اختلاف کے بعد مسلمانوں میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں اعتقادی اختلاف کی ابتدا مسئلہ تقدیر سے ہوئی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ:

اول من قال فی القدر بالبصرۃ معبد الجہنی حدیث ابن عمر مسلم

سب سے پہلے تقدیر کے مسئلہ پر بصرہ میں معبد جہنی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

مقریزی نے بھی خطط میں لکھا ہے کہ:-

اخذ معبد هذا الرأي من رجل من الأساورة يقال له أبو يونس سنسويه ويعرف بالأسواري (ص ۱۰۱ ج ۳)

معبد جہنی نے دراصل اس عقیدہ کو سنسویہ سے اخذ کیا تھا۔ جو اساورہ میں تھا سنسویہ کی کنیت ابو یونس تھی اور یہ الاسواری کی نسبت سے منسوب تھا۔

سنسویہ یزدگرد کے باڈی گارڈ کا افسر تھا

الاسواری کا مطلب البلاذری کی فتوح میں دیکھئے لکھا ہے کہ ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کے خاص باڈی گارڈ کے یہ سوار تھے سیاہ الاسواری ان کا کمانڈر تھا۔ اصطخر[1] کی حفاظت کے لئے یزدگرد نے اس کو بھیجا اور وہاں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے مقابلہ میں سوس پہنچا جہاں شکست فاش کھانے کے بعد صلح کی درخواست کی اور مسلمان ہو کر بصرہ میں معاہدہ کر کے الاسواری مقیم ہو گئے یہ سنسویہ انہی الاسواریوں کا ایک آدمی تھا۔ یہ مسلمان ہونے کے بعد مجوسی عقیدہ کے زیر اثر مسلمانوں میں قدر کے مسئلہ کو پھیلا کر پہلی دفعہ ایک اعتقادی فرقہ کی بنیاد ڈالی کے یہ تصور قائم ہو گئی امام بخاری ہی نے خواجہ حسن بصری کا قول معتزلہ کے متعلق نقل کیا ہے۔

---

[1] یہ ایک شہر پرسی پولس یا تخت جمشید بھی اصطخر کو کہتے تھے ایرانیوں کا سب سے بڑا مقدس شہر تھا ابن حزم نے لکھا ہے کہ شہرائے بصرہ ایرانیوں کی مذہبی کتاب کا نام [illegible] تک اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا حق صرف اصطخر کے موبد ہی کو تھا گویا ایران کا وہ بنارس تھا [illegible]۔

کے وہی بات چھپی ہوئی تھی کہ خدا ہی شر کا بھی خالق ہے اور خیر کا بھی خالق ہے۔ وہی زردشتی کا بھی دراصل صحیح عقیدہ تھا۔ لیکن فلسفیانہ موشگافیوں نے بجائے ایک کے خیر کے لئے الگ خالق اور شر کے لئے علیحدہ خالق کا عقیدہ ایرانیوں میں پیدا کر دیا مانا گیا کہ خیر اور بھلی چیزوں کے خالق کا یزدان اور شر یعنی بری چیزوں کا خالق اہرمن ہے۔ ایرانیوں کا یہی غلط فلسفہ جو آخر میں ان کا دینی عقیدہ بن گیا تھا، سچ پوچھئے تو مسلمانوں میں یہی پھیلا اسی غلط عقیدہ نے مسئلہ قدر کی شکل اختیار کر لی تھی یہ تو ہوئی مسئلہ کی حقیقت۔ باقی مسلمانوں میں اس کو سب سے پہلے کس نے چھیڑا۔ صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت میں اگرچہ بصرہ کے رہنے والے معبد جہنی کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن امام بخاری نے اپنے رسالہ خلق افعال العباد میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ:

المعتزلۃ فانھم ادعوا ان فعل اللّٰہ مخلوق وان افعال العباد غیر مخلوق۔	معتزلہ مدعی ہیں کہ اللہ کا فعل تو مخلوق ہے اور بندوں کے افعال مخلوق نہیں ہیں۔ یعنی خدا کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں۔

آگے خبر دی ہے کہ:

سنسویہ ایرانی نے مسلمانوں میں اس مسئلہ کو چھیڑا

وھذا اختلاف منھم المسلمین ان کنت تعلق من البصریین یقال سنسویہ کان مجوسیا قادمی الاسلام منہ	عام مسلمان تو کچھ جانتے ہیں اس کے یہ مخالف ہے۔ البتہ بصرہ میں جن لوگوں نے سنسویہ کی بات مانی۔ سنسویہ پہلے مجوسی تھا پھر کہ اسلام کا مدعی ہوا۔

الثورت مباشتہ
کے انضمام تک ۔

اس کے بعد تو معتزلہ کا جو حال ہوا، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے کتب خانوں میں ڈھونڈنے والے برسوں سے ڈھونڈ رہے ہیں کہ اس فرقہ کی کوئی کتاب کلام یا اصول فقہ وغیرہ جیسے علوم کے متعلق مل جاتی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ کتاب تو کتاب شاید چند اوراق بھی نہیں مل سکتے :اہل السنت والجماعت کی کتابوں میں معتزلہ کے آراء و نظریات کا تردیداً جو ذکر کیا گیا ہے کچھ تو ان سے ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اور بعض کتابیں تفسیر یا لغت و ادب میں ان کی جو ملتی ہیں ان سے ان کے اعتقادی رجحانات کی سراغ رسانی میں تھوڑی بہت مدد ملتی ہے۔

کچھ بھی ہو میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے اختلافات جنہیں صحیح معنوں میں ہم اصولی اختلافات کہہ سکتے ہیں زیادہ تر ان کی پیدائش میں سیاسی اختلافات کو ہم دخیل پاتے ہیں، یا پھر باہر سے مسلمانوں کے اندر چیزیں مختلف راہوں سے داخل ہوتی رہیں۔ خیالات پر وہ بھی اثر انداز ہوئیں ابتداء اسلام میں مختلف دینی قوموں کے افراد مسلمان ہو کر اسلامی دائرہ میں داخل ہو رہے تھے اپنے ساتھ اپنے آبائی عواطف موروثی رجحانات کو بھی وہ لائے بجائے تصحیح کام لیتے۔ بعضوں نے تطبیق کا ارادہ کیا چاہا کہ خاندانی روایات و احساسات میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے ان کو قرآنی نصوص کے مطابق بنالیں یا قرآنی تعلیمات کو کھینچ تان کر اپنے آبائی خیالات پر منطبق کر کے دونوں ہی سے اپنا تعلق باقی رکھیں مگر جنہ

؎ کے یعنی دین کی قدر تی کتاب کا آخری ایڈیشن قرار دے کر تصحیح کا م

معتزلہ کو ایرانیوں نے ہلاک کیا

خواجہ حسن بصری کا قول

اھلکتھم العجمۃ (الفلاسفۃ) معتزلہ کو ایرانیت نے ہلاک کر دیا۔

دیکھا آپ نے کھونے کے بعد معتزلہ کی بنیاد کہاں ملی!۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی چند ابتدائی صدیوں میں کافی زور اس فرقہ کا رہا خصوصاً بعض عباسی حکمرانوں کی پشت پناہی میں بہت کچھ کھیل کھیلنے کا بھی موقع ان کو ملا لیکن وہ جو کچھ بھی ہوں قرآن کو مخلوق مانتے ہوں یا غیر مخلوق اتنی بات تو بہر حال ان کے اندر بھی جاگزیں تھی کہ یہ خدا کا کلام ہے اور قول فیصل ہونے کا قدرتی استحقاق قرآن ہی کو حاصل ہے ابتدا میں ان کو شاید محسوس ہوا ہو کہ کس کو تابع اور کس کو متبوع بنا رہے ہیں لیکن جیسے جیسے ایک نسل کے بعد دوسری نسلیں ان کی گذرتی رہیں وہ نکھرتے جاتے تھے تاآنکہ ایرانیت کا دور دبادُ گھٹتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اب ڈھونڈنے سے بھی معتزلہ کا پتہ مسلمانوں میں نہیں چلتا۔ ہمارے مورخین نے لکھا ہے کہ:۔

علم کلام کی باگ

معتزلہ کے ہاتھوں میں دو سو سال رہی

کان علم الکلام بایدی المعتزلۃ مابین مائتین سنۃ و

علم کلام کی باگ معتزلہ کے ہاتھوں میں دو سو سال تک رہا یعنی پہلی صدی کے بعد تیسری صدی

دانستہ جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے اس بدگمانی سے بچتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنے آبائی • لو تات سے قطعی بے گانگی ان کے لئے آسان بھی نہ تھی۔ بہر حال دانستہ ہو یا نادانستہ مگر ہوا یہی کہ تاویل و تعبیر یا کھینچ تان کی اس مکروہ و ناپسندیدہ کوشش نے مسلمانوں میں ایسے خیالات پیدا کر دیئے جنہیں صحیح معنوں میں نہ تو اسلامی تعلیمات ہی کا صحیح ترجمہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو ان کے موروثی عقائد بھی اپنے اصلی رنگ کو کھو کر نئے قالب میں جلوہ گر ہوئے۔ یہی قدر کا مسئلہ ہے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں آپ پڑھ چکے کہ قدریہ کا یہ نظریہ جو آج کل ہماری کتابوں میں مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ کی طرف منسوب ہے یعنی اپنے اختیاری اعمال و افعال کے خالق خود بندے ہیں، خدا کی تخلیقی کارفرمائیوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدر کے اس عقیدے کی بنیاد تو ڈالی مسلمانوں میں ایک پارسی نو مسلم سنسویہ نامی نے جو ایرانی فرقے کے اسواریوں سے تعلق رکھتا تھا بات وہی تھی کہ کائنات میں شر یا برائی کا پہلو جن چیزوں میں پایا جاتا ہے ایرانی ذہنیت تقریباً قرن سے عادی تھی کہ ان کی آفرینش اور خلق سے حق تعالیٰ کی ذات کو پاک قرار دے۔ ساری برائیوں کی پیدائش کا الزام اہرمن کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔ اس باب میں ایران باشندوں کی حسی نزاکت اس درجہ تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھی کہ اہرمن کے لفظ لکھنے کی ضرورت ہوتی تو بیان کیا جاتا ہے کہ الٹے کر لکھا کرتے

تعلق ہوتا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقل اس کو بھی تو سوچ نہیں سکتی کہ بندے جو خدا کی کن فیکونی مخلوقات ہیں، اپنے اعمال و افعال کی تخلیق و آفرینش میں کلیتہً استقلالی اقتدار کے مالک ہیں بلکہ نصوص کا اقتضا بھی یہی ہے اور عقل بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اسی فیصلہ پر مجبور ہے کہ اپنے وجود میں صفات میں، بندے جیسے ہر لمحہ خالق تعالیٰ کی تخلیقی کارفرمائیوں کے دست نگر ہیں اسی طرح اعمال و افعال جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں ان کی تخلیق و آفرینش کا تعلق بھی براہ راست خالق کائنات ہی کے مسلسل تخلیقی فیض اور ارادے کے ساتھ وابستہ تسلیم کیا جائے۔

الغرض بندوں کے اختیاری اعمال و افعال کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی حیثیت سے بندوں کو بھی دخل ہے واقعہ کی اصل حقیقت یہی ہے اور اسلامی وثائق میں نصوص جو پائے جاتے ہیں ان میں واقعہ کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں مسئلہ کو اسی اجمالی رنگ میں لوگ مانتے چلے آرہے تھے۔ لیکن یہی شعوبیہ ایرانی پہلا آدمی تھا جس نے مسلمانوں میں بجائے اجمال کے جا بجا کر بندوں کے اعمال و افعال کے تخلیقی عمل سے خدائی ارادے کو قطعاً بے تعلق ٹھہرا دیا جائے اسی کے مقابلہ میں ایک دوسرا فرقہ اٹھ کھڑا ہوا جو جبر محض کے خیال کو مسلمانوں میں پھیلانے لگا حاصل جس کا یہی ہے کہ بندہ مجبور محض ہے نیک و بد اعمال جو بھی بندوں سے صادر ہوتے ہیں انکو براہ راست خدا پیدا کرتا ہے بندے کے ارادہ و اختیار کو ان میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے

* مجبور اعضا تکوینی ہوا اپنے خالق کے تخلیقی فیض کا ہر آن اور ہر لمحہ محتاج ہے جو آسیہ میری کتاب الدین القیم۔ میں مسئلہ کی تفصیل دیکھئے۔

ظاہر ہے کہ خلقِ شر کے متعلق جن کی ذہنی نزاکتوں کا یہ حال ہو قبول اسلام کے بعد اگر یزداں، کے بجائے اعمال وافعال کا خالق بجائے خدا کے بندوں ہی کو وہ ٹھہرانے لگے اور پھر اعمال وافعال کے بعد لازمی طور پر نیک اعمال کے خلق وآفرینش کو بھی بندوں ہی کی طرف منسوب کرنا ناگزیر تھا، یہی خلق افعال کا مسئلہ ہے جس کی اصطلاحی تعبیر قدر کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ اختیاری اعمال وافعال کی جزا وسزا کے قانون کی تصحیح کے لئے ناگزیر ہے کہ بندوں کو بھی ان کے افعال کی پیدائش میں اس حد تک دخیل مانا جائے کہ فعل کی ذمہ داری کرنے والوں کے سر عاید ہو سکے۔

لیکن اسی کے ساتھ خالق قیوم کا اپنے کن فیکونی مخلوقات[1] سے جو

[1] کن فیکونی مخلوقات کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے چاہیئے کہ ہم میں ہر شخص خود اپنے اندر غور کرے، اپنے معلومات کو خیالی قوت سے ہم جو پیدا کرتے ہیں سوچئے کہ اس وقت کیا ہوتا ہے دلی کی جامع مسجد کو آپ جانتے ہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالی قوت سے اپنے اسی معلوم یعنی جامع مسجد کو اپنے سامنے آپ کھڑی کر لیتے ہیں یہ آپ کی تخلیق کی کارفرمائی ہے غور کیجئے کہ یہ خیالی جامع مسجد جو آپ کے ذہن کے سامنے کھڑی ہے صرف پیدا ہونے ہی میں آپ کے ارادے کی محتاج نہیں ہے بلکہ باقی رہنا اس کا یہ بھی آپ کی توجہ کے ساتھ وابستہ ہے اس کو کن فیکونی مخلوق کہتے ہیں کہ ارادہ کے ساتھ آپ کا معلوم آپ کی مخلوق بنا جاتا ہے اسی طرح دیکھئے آپ جانتے ہیں اور آپ کا معلوم ہے خیالی قوت سے اسی معلوم کو اپنی مخلوق بنا کر دیکھئے وہ اپنی پیدائش ہی میں بھی بقا میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کا محتاج نظر آئے گی، چاہیں گے تو رہنے کا ہٹائیں گے تو مٹے گا رو نہیں گے تو رہے گا جب تائیں گے تو مٹے گا یہی مطلب ہے کہ کن فیکونی مخلوق ذاتا

بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے

فرقہ جبریہ کا بانی جہم بن صفوان

کہتے ہیں کہ تابعین یعنی صحابہ کے تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے زمانہ میں جبر کے اس نظریہ سے مسلمانوں کو سب سے پہلے ایک شخص جہم نامی نے آشنا کیا تھا۔ اس کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ نامی فرقہ پیدا ہوا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں کو جہم اور جہمیہ کے چرچوں سے ہم معمور پاتے ہیں

مگر جہم کون تھا کن لوگوں سے متاثر ہوا جبر کے سوا اور بھی کس کس قسم کے اعتقادی اختلافات کی مسلمانوں میں اس کی وجہ سے بنیاد پڑی یہی سننے کی بات ہے۔

جہم ہندوستان کے فلاسفہ سے متاثر ہوا

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی تاجروں کا تجارتی قافلہ بلخ ہوتا ہوا سمرقند جایا کرتا تھا۔ اس کو راستہ میں مشہور خراسانی شہر ترمذ کے قریب نویذ نامی مقام پر دریائے زائل کو عبور کرنا پڑتا تھا جو جیحوں کا معاون دریا ہے یہ نویذ ہمارے یہاں کی تاریخوں میں قرب مکانی کی وجہ سے معبر ترمذ کے نام سے موسوم تھا یعنی ترمذی گزرگاہ یا گھاٹ اس کو کہتے تھے۔ اسی معبر ترمذ پر محصول وصول کرنے والوں کی ایک چوکی بنی تھی۔ بنی امیہ کا زمانہ تھا۔ ہشام[1] بن عبدالملک کی حکومت کے ایام میں معبر ترمذ (نویذ)

[1] ہشام بن عبدالملک بنی امیہ [illegible] ہجری کے [illegible] تک [illegible]

بقیہ حاشیہ آئندہ

تھے بلخ میں باب الہند کے نام سے اسی لئے ایک مستقل دروازہ تھا [1]

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجروں ہی کی طرف سے جہم بن صفوان کے دل میں پہلی دفعہ یہ سوال ڈالا گیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ قرآن پڑھتے تھے۔ اس میں خدا کے متعلق یہ بھی تھا کہ الرحمان عرش پر مستوی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی اسی قرآن ہی میں موجود ہے کہ وہی ہر شئے کو محیط ہے، وہی ہر ایک کے ساتھ ہے وہ حبل الورید (گردن کی شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے، وہی اول ہے، وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے۔ وہی باطن ہے۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے [2] الغرض مسلمان عرش والی آیت کو بھی پڑھتے تھے۔ اور دوسری آیتیں بھی برابر ان کی تلاوت میں گذرتی رہتی تھیں ان کے ایمان میں دونوں ہی کی گنجائش تھی حقیقت بھی ان ہی اجمالی تعبیروں میں پوشیدہ تھی کچھ یہ بھی کچھ وہ بھی، ٹھیک جیسے خلق افعال کے قصے میں کچھ یہ بھی صحیح کچھ وہ بھی صحیح یہی واقعیت کی صحیح ترجمانی ہے۔

---

[1] جغرافیائی معلومات کے لئے جی۔ لی۔ اسٹرینج کی کتاب "جغرافیہ خلافت مشرقی" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جس کا ترجمہ اردو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے شائع کیا ہے ۱۲۔

[2] تمثیلیہ اشتہ یعنی انسان خود اپنے اندر دیکھتا ہے کہ اس کی روح بدن کے کسی حصہ سے غائب نہیں ہوتی ہر ایک پر شاہد و حاضر ہے تاہم قلب کے ساتھ روح کا خاص استوائی تعلق ہے ایسا تعلق کہ سارے بدنی نظام کا کاروبار اسی سے چل رہا ہے قلب سے روح کا استوائی تعلق جس وقت ختم ہو جاتا ہے بدن کے سارے اجزا منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے جنگی کی چوکی کی معمولی ملازمت ہی اس کو مل سکی تھی ۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے ۔

كان على معبر ترمذ — ترمذ کی گزرگاہ پر ایک ناکہ پر رہتا تھا ۔

جہم کے یہ تو مختصر ذاتی حالات تھے ۔

اب سنئے ذہبی نے اپنی کتاب العلو میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جس زمانہ میں جہم ترمذ کی گزرگاہ والی چوکی میں مقیم تھا ۔

فكلم السمنية فقالوا صف لنا — جہم کی سمنیہ فرقوں سے بات چیت ہوئی

ربك الذى تعبد[1] — سمنیہ فرقہ والوں نے پوچھا کہ جس خدا کو تو

كتاب العلو للذهبى المقصود — پوجتا ہے اس کے صفات بیان کر ۔

آپ نے سمجھا سمنیہ کے اس لفظ سے کیا مراد ہے ؟ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی فرقہ کی تعبیر مسلمانوں کے علم کلام کی کتابوں میں سمنیہ کے لفظ سے کی جاتی ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں نے ان لوگوں کو سمنیہ کہنا شروع کیا تھا واللہ اعلم بالصواب ۔

عرض کر چکا ہوں کہ بلخ کے مسافر سمرقند جانے کے لئے ترمذ کے اس معبر نویدہ سے گزرتے تھے اور بلخ ہی وہ مقام تھا جو باب الہند سمجھا جاتا تھا ۔ ہندوستان کے تجار خراسان جانے کے لئے پہلے بلخ ہی پہنچتے

[1] یاد رکھنا چاہئے کہ بدھ مذہب کے یہ علماء ہوں ۔ ابوریحان بیرونی نے الآثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ خراسان وا سے بدھ مت کے ماننے والوں کو "شمنان" کہتے تھے ۔

سن ۱۹۵ ق ۱۲ تیغ لبندی — کوئی چیز خالی نہیں ،

غلط وحدت الوجود کا تخم اول

اور یہی تھا اس غلط وحدت الوجود کا تخم اول جسے مسلمان صوفیوں کے بعض طبقات میں غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل ہوئی۔ مسئلہ کی ابتدائی تعبیر ایک سادہ دل ، غیر علمی آدمی کی تھی ، ہو سکتی تھی عرش پر الرحمٰن کا استواء جو قرآن کا منصوص مسئلہ تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا اور اجمال جو مسئلہ کی روح تھی جہم نے چاہا کہ مسلمانوں کو اس سے ہٹا دے اس کے مقابلہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو عرش والی نص کو اصل قرار دے کر قرآن ہی کے دوسرے بیانات جن میں احاطہ معیت ، قرب اقربیت ، اولیت و آخریت ظاہریت و باطنیت کا صراحتہً ذکر کیا گیا ہے ان سب ہی اللہ کے بندوں سے تاویلیں کی۔ ابہام و اجمال کی قدر و قیمت گم ہو گئی دو مستقل فرقے عرشیوں اور فرشیوں کے پیدا ہو گئے۔

ان عرشیوں اور فرشیوں کا قصہ اتنا دراز ہے جس کے لئے اس مختصر سے مضمون میں بھلا کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] امام بخاری نے اپنی کتاب خلق افعال العباد میں ایک روایت درج کی ہے جس میں راوی نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی سورۂ طٰہٰ کی آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ کا ذکر کرتے ہوئے جہم ایک دن بولا کاش میرے بس کی بات ہوتی تو اس آیت کو قرآن سے چھیل کر نکال دیتا صرف فرشیوں کی اس عجز و آرزو کے مقابلہ میں اس سے تو کچھ ہوتے نہیں سنا

لیکن جہم جو نہ خود علم سے بہرہ رکھتا تھا اور نہ علماء کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع اس کو ملا تھا اچانک "ہندی فلسفہ" کی لا حاصل موشگافیوں سے اس کا دماغ دوچار ہوا، ممکن ہے کہ سوال کے بعد

فتحل: لبیت لا یخرج مدة — جہم کو تفکر کا مرض لگ گیا اور زمانہ تک باہر نہ نکلا

(فتح الباری ص ۲۹۵ ج ۱۳)

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس دن تک مبہوت رہا جن میں نماز بھی اس نے نہ پڑھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمینہ (ہندی تاجروں) نے صرف سوال ہی کر کے چھوڑ نہیں دیا تھا بلکہ سوال و جواب کا سلسلہ بھی دونوں طرف سے جاری رہا۔

امام بخاری نے اپنی کتاب "افعال العباد" میں جو روایت اسی سلسلہ میں درج کی ہے، اس کے ان الفاظ سے یعنی۔

فی صحبه بعض السمینة فشکك — جہم سے سمینہ فرقہ کے بعض لوگوں نے مباحثہ کیا، پس جہم شک میں مبتلا ہو گیا اور چالیس

واقام اربعین یوما لا یصلی — دن ایسے گزرے جن میں نماز نہ پڑھی۔

صـ۹۳

ان سے تو صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ جہم اور سمینہ میں کافی گفتگو ہوئی اس کے بعد دیکھا گیا کہ لوگوں کے سامنے اپنے عقیدے کا اظہار حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کے متعلق یہی جہم ان الفاظ میں کر رہا ہے کہ

هو هذا الهواء مع کل شیء و — وہ خدا یہی ہوا ہے ہر چیز کے ساتھ

فی کل شیء ولا یخلو منه شیء — ہر چیز میں اور اس سے (خدا) سے

قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا لیکن قرآن میں خدا کی طرف جن صفات کا انتساب کیا گیا ہے ان کا قطعی انکار کیسے کیا جا سکتا ہے جہم اس کے اس نظریے اور دعا نے کلام کے مسئلہ کو پیدا کیا کہتا تھا کہ کلام تو مخلوق کی صفت ہے خدا اس سے کیسے موصوف ہو سکتا ہے۔

بہرحال جہم پہلا آدمی تھا جس نے خدا کی صفت کلام کا انکار کر کے قرآن کو بجائے کلام اللہ کے مخلوق اللہ کہنے کا شوشہ مسلمانوں کو دیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے اس مسئلہ کے تاریخی تفصیلات سے لوگ عموماً واقف ہیں، ابتدائی بنیاد اس کی جہم ہی نے رکھی تھی۔[1]

ارباب صدق و صفا، اخلاص و وفا کو اس راہ میں جن شدائد و مصائب سے گزرنا پڑا، خصوصاً سراج الامت سیدنا حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اسلامی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں یہ داستان آج تک لکھی ہوئی ہے۔

مسئلہ انا الحق کی بنیاد

اسی طرح انسانی وجود کا شعوری نقطہ یا ذات کا احساس یعنی

---

[1] اس موقع پر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں ہمارے وطن ہندوستان میں یہ مسئلہ مذہبی دائرے میں چھڑا ہوا تھا کہ وید کے شبد یعنی کلام قدیم ہے یا حادث۔ میمانسا والے قدیم مانتے تھے۔ نیائے والے حادث۔ دیکھو قرون وسطیٰ میں ہندوستان۔

میں تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ سیاسی خرخشوں کے بعد جتنے اصولی اختلافات بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ اگر سراغ لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا رشتہ براہ راست اسلام سے نہیں بلکہ اسلامی دائرے کے بیرونی فتنوں سے ہے یہی جہم تھا جس نے خدا کو ہوا ٹھیراتے ہوئے "ہر چیز میں ہر چیز کے اندر" بتاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں پائی جہم وہ اس تنزیہی عقیدے کا بھی داعی تھا کہ۔

لا اصفہ بوصف یجوز اطلاقہ علیٰ غیرہ ۔ | میں ایسی صفت جس کا اطلاق غیر خدا کی طرف ہوتا ہو ہم خدا کی طرف اس صفت کو منسوب نہیں کر سکتے۔

(ص ۱۹۲ فتح الباری ج ۱۳)

اسی لئے خدا کو حی (زندہ) عالم (دانا) مرید (ارادہ کرنے والا) کہنا یا وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، ان باتوں کے انتساب کو وہ ناجائز قرار دیتا تھا مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جہم کی تنزیہی تعلیم کو سن کر کہا تھا کہ مآل اس کا یہی ہے کہ خدا گویا کچھ نہیں ہے، معدوم ہے واقعہ یہاں بھی وہی تھا کہ لیس کمثلہ شیٔ کی بنیاد پر خدائی صفات کو مخلوقات کے صفات پر

ہے لیکن قرشیوں کے دل میں بھی قرب احاطہ معیت اقربیت اولیت آخریت ظاہریت باطنیت والی آیتوں کے متعلق کچھ اسی قسم کے تنائی جیسا ہے اضطراب گزرا تھا جب تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے آخر عرش کے مضمون والی ایک آیت کو اصل قرار دے کر قرآن کی بیسیوں آیتوں کے ساتھ تو ڑ دیں بلکہ شاید تحریف تک ان کی جرأت کیا معمولی جرأت ہے ۱۲۔

شعور ہی شعور ہے۔ جب حق تعالیٰ اس سے غائب نہیں ہیں بلکہ اس شعور کا نقطہ پہچپی وہ شاہد و حاضر ہیں تو "انا" کے لئے ذات حق کا شعور ظاہر ہے کہ ایک بدیہی بات ہے لیکن اس سے نہ آدمی کا "انا" حق بن جاتا ہے اور نہ کسی طرح یہ سمجھنا درست ہو سکتا ہے کہ

انا الحق والے حسین بن منصور کا ہندوستان سے رشتہ

حق انا ہے کیا جینائی نور ہے یا شنوائی کی قوت آواز ہے، بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی لیکن جانتے ہیں سب سے پہلے "انا الحق" کا نعرہ مسلمانوں میں جس نے لگایا یعنی حسین بن منصور جو عوام میں منصور ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جانتے ہیں کہ اس منصوری دعوی کے مدعی حسین بن منصور کون تھے؟

الخطیب اپنی تاریخ بغداد میں اطلاع دیتے ہیں کہ

کان جدہ مجوسیاً اسمہ محمی من اھل بیضاء فارس صـ۱۱۲ ج ۸ ۔ | حسین بن منصور کا دادا مجوسی تھا نام اس کا محمی تھا ایران کے شہر بیضا کا رہنے والا تھا۔

اور صرف یہی نہیں خطیب نے حسین بن منصور کے صاحبزادے احمد نامی کے حوالہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ ان کے والد حسین بن منصور نے

قصد الی الھند صـ۱۱۲ | ہندوستان کا ارادہ کیا۔

لکھا ہے کہ ہندوستان سے پھر ماوراء النہر ترکستان اور چین بھی

ہیں جسے "انا" فارسی میں "من" اور ہم ہندوستان والے "ہم" کے
لفظ کا اطلاق جس پر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ جیسے دنیا کی ہر چیز "شئی"
ہے "شئی" کے نیچے ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ بھی داخل ہے۔
ایسی صورت میں یہ بات کہ کسی شئے سے خدا غائب نہیں ہے بلکہ
قرآنی الفاظ میں۔

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ — اور اللہ ہر چیز پر شاہد و حاضر ہے

کا کھلا ہوا اقتضا یہی ہے کہ جب ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ "انا"
بھی شئے ہے تو حق تعالیٰ کا "انا" کے لئے شہید و حاضر ہونا، قرآن ہی
کی سکھائی ہوئی بات ہے، یہی منوایا گیا تھا اسی کو مسلمان مانتے چلے
آتے تھے ایک جاہل ان پڑھ مسلمان بھی اپنے آپ کو مثلاً کسی مصیبت
میں جب مبتلا پاتا ہے تو دل ہی دل میں دعا سی "علیٰ کل شئی شہید"
ہستی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر سوال و جواب کا سلسلہ
بھی شروع کر دیتا ہے یہ روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے، ظاہر ہے کہ حق
تعالیٰ کے شعور کو اپنے "انا" میں اگر وہ نہیں پاتا تو اضطراراً یہ حرکت اس
سے کبھی سرزد نہ ہوتی بلکہ شاید اس احساس و شعور کے لئے تو مسلمان
ہونا بھی ضروری نہیں بظاہر آدمی کا یہ فطری احساس معلوم ہوتا ہے۔ جو
بہر حال نظر کے سامنے نور ہو اور خود کا شعور نظر کر رہا ہو۔ شنوائی کی
کی قوت تک آواز پہنچ جائے اور آواز کو شنوائی کی قوت محسوس نہ کرے
جیسے یہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انسانی وجود کا وہ حصہ جو منطقی شعور، اور

کے ساحل پر اترتے دیکھا تھا اور اس سے بھی حسین نے کہا تھا کہ میں یہاں
کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں ۔ واللہ اعلم سحر کے لفظ سے مراد کیا تھی
بظاہر یوگا "یا جوگ" جو اس ملک کے باشندوں کا خاص فن تھا اسی کا سیکھنا
مقصود ہو۔ علی الماسب کی روایت میں ہے کہ ساحل پر اترنے کے بعد
میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کٹیا بنی ہوئی ہے اس میں ایک
بوڑھا آدمی نظر آیا ۔ حسین اسی بوڑھے کی کٹیا میں چلا گیا اور سحر کے متعلق
باتیں دریافت کرنی شروع کیں ۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی جوگی
ہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی خود حسین کی زندگی کے تفصیلات اس
کتاب میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی زندگی
مدتوں جوگیوں ہی کی زندگی رہی ۔

بہر حال اس وقت نہ مجھے حسین بن منصور کی شخصیت سے بحث ہے
اور نہ ان کے مسئلہ " انا الحق "[1] سے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک سیدھی
سادی بات کو مسلمانوں کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت جو حاصل ہو گئی
عموماً یہ کیفیت بیرونی موثرات ہی نے پیدا کی ہے ایسے مسائل جن میں مختلف
پہلوؤں کی گنجائش ہو ۔ اور کچھ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح ہو " بجائے کچھ کے
ایک ہی پہلو پر زور دینے کا آخری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصل حقیقت نگاہوں
سے اوجھل ہو جاتی ہے اور آدمی مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے در حقیقت

---

[1] شنکر اچاریہ جو ساتویں صدی عیسوی یعنی ظہور اسلام کے بعد ہندوستانی مشہور ریفارمر ہیں ان کا نظریہ تھا کہ
آتما اور پرماتما میں دوئی نہیں ہے حتیٰ" قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۔

اسلام کے خاص پیدا کردہ ماحول کی وجہ سے مذہب اور دین کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔ کھیلنے والے دراصل سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے تھے لیکن اپنے کھیل میں اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ مذہب کا لبادہ اوپر سے سیاسی اغراض پر اوڑھا نہ دیا جاتا۔

اسی طرح بیرونی اسباب میں سب سے زیادہ نمایاں سبب یہی نظر آتا ہے کہ اوہام و اغلاط جن میں قبل الاسلام کے ادیان لت پت تھے اور ان ہی سے پاک کرنے کے لئے خالق کائنات نے اپنے بندوں میں آخری رسول کو اٹھایا تھا۔ قرآن کے اتارنے کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ انسانی زندگی کا قدرتی آئین جن آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے انسانی گھرانوں میں وقتاً فوقتاً نافذ ہوتا رہتا تھا ان کتابوں میں من مانے خیالات شریک کر دیئے گئے تھے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی خالص مرضی کے مطابق جی کر جو مرنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے تسلی اور تسکین کا کوئی قابل اعتبار ذریعہ دنیا میں کسی قوم اور ملک میں آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر باقی نہ رہا تھا بطور آخری اڈیشن کے قرآن نازل کیا گیا تاکہ اپنے اپنے موروثی ادیان اور آبائی مذاہب کی مشکوک کتابوں کو قرآن پر پیش کر کر کے شک سے نکل کر یقین کی ٹھنڈی روشنی میں لوگ آجائیں۔

داخل ہونے والے اسلام میں گو ناداخل بھی اسی لئے ہوئے تھے لیکن ان میں سب کا حال ایک جیسا نہیں تھا۔ جرم میں جن کے خامی تھی، حوصلے جن کے زیادہ بلند نہ تھے اپنے موروثی مالوفات کے انس

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ نہیں ہے کہ قرآن کو نہیں مانا تھا اور قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے لیکن انہوں نے پیغمبر قرآن کے ساتھ تعلیمی نسبت تزکیہ سے پہلے قائم کر لی۔ حالانکہ قرآن ہی میں کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن کی پیغمبر آیتیں تلاوت کرنے میں پھر ماننے والوں کے اندر کی غلطیوں کو صاف کرتے ہیں تب تعلیم دیتے ہیں بلکہ مگر صفائی جن کی مکمل نہیں ہوتی تھی انہوں نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کا ارادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ پہلے سے ان کے پاس تھا کچھ تبدیلی اس میں ضرور ہوئی لیکن قرآنی تعلیمات بھی اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ ان میں جاگزین نہ ہوسکے ان کا طریقۂ عمل غیر فطری تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا تھا جو ہوا۔

بہرحال اصولی اور بنیادی اختلافات جن کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی دینی فرقہ نے اپنی دینی زندگی اور اس کے نتائج کو دوسرے مسلمانوں کی دینی زندگی اور اس کے نتائج سے الگ کر لیا ہو تفرق اور شقاق بعید کے اس حال کی پیدائش میں ممکن ہے ڈھونڈنے والوں کو دوسرے اسباب کا بھی سراغ مل جائے لیکن عام حالات میں کم از کم میرا خیال یہی ہے اور اپنے محدود مطالعہ سے اسی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اندرونی اسباب میں تو زیادہ اثر ان سیاسی اختلافات کا پڑا ہے جن پر ابتداء

یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ مشہور قرآنی آیت کا یہی اقتضا ہے۔

والفت کے ازالہ پر جیسا کہ چاہئیے تھا قادر نہ ہو سکے جس کی تطہیر و تزکیہ
کی اس راہ میں بہر حال ضرورت تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری اور زیادہ
تر غیر شعوری طور پر آبائی اوہام و اغلاط اور اسلامی تعلیمات میں تطبیق و
توفیق کی نکو ہیدہ کوششوں میں وہ مشغول ہو گئے اسی نامبارک سعی اور
غلط اقدام نے عجیب و غریب نظریات و خیالات کو مسلمانوں میں پھیلا
کر مختلف ٹولیوں میں ان کو بانٹ دیا تھا۔ دین اسلامی کی تاریخ
کا یہ بڑا مبسوط مضمون ہے۔ تاہم بقدر ضرورت اس سلسلہ میں جو کچھ
پیش کیا جا چکا ہے۔ اگر پڑھنے والوں نے توجہ سے اس کو پڑھ لیا ہے
تو شاید وہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے جس نتیجہ تک مطالعہ
اور جستجو نے مجھے پہنچایا ہے۔

اس کے بعد خود سوچنا چاہئیے کہ سیاسی جوڑ توڑ کے لئے مذہبی جو
رنگ اختیار کرنے والوں نے جن فرقوں کو مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا
ان کا جو انجام ہوا۔ اس کے سوا دوسرا انجام ان کا آخری ہو ہی کیا سکتا تھا
یہ سیاسی قصے زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ میدان میں ایک
پارٹی آتی ہے۔ کھیلتی ہے ہنگامے مچاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔
انسانیت کی تاریخ سیاسی بازی گریوں کے ان تماشوں سے بھری ہوئی
ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی یہی کھیل کھیلے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا
کہ سیاسی شاطروں کے ساتھ شطرنج کی وہ بساط بھی الٹتی چلی گئی جو وقتاً
فوقتاً بچھتی رہی اور ان کے ساتھ وہ فرقے بھی ختم ہوتے چلے گئے جو پیدا ہوا

قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والوں میں جو ہمارے
مخالف ہیں۔ ہم ان کو مشرک تو نہیں سمجھتے۔ لیکن چونکہ ہمارے
مخالف ہیں اس لئے کافر قرار دے کر ان کے مال کو مال
غنیمت ہم بنا سکتے ہیں اور ان کے ہتھیار اور گھوڑے چھین
لیں گے۔ اگرچہ اسی کے ساتھ ان کی عورتوں کے ساتھ
نکاح بھی جائز ہے اور ان کے مال کے ہم وارث بھی بن سکتے
ہیں۔

مسلمانوں کے تمام ممالک کے متعلق ان کا خیال تھا کہ دارالاسلام
تو نہیں لیکن دارالتوحید ان کو کہنا چاہئے لیکن حکومت کی
فوجی چھاؤنیاں جن علاقوں میں قائم ہیں وہ دارالتوحید بھی نہیں
ہیں۔ بلکہ دارالفسق ہیں۔ ص ۱۶۳ -

بتایا جائے کہ اس ابن اباض کی طرف منسوب کر کے اباضیہ نامی
جس فرقہ کا ذکر کیا جاتا ہے کتابوں کے سوا سطح زمین پہ کہاں مل سکتا ہے
اسی طرح حالات نے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں اس قسم کے
خیال کے لوگوں کو بھی پیدا کر دیا تھا۔ جنہوں نے دنیا کو دو حصوں میں بانٹا
تھا جہاں اسلامی احکام کا اعلان و اظہار کھلے بندوں بے روک ٹوک
جاری ہو ان علاقوں کا نام ان کی اصطلاح میں "دارالعلانیہ" تھا اور
جہاں مسلمانوں کو اس قسم کی آزادی حاصل نہ ہو اس کا نام انہوں نے
"دارالتقیہ" رکھا تھا اس تقسیم کے ساتھ یہ اس کے بھی قائل تھے کہ۔

اگر پہنچ جاتے تو شاید اس سے زیادہ تحفہ ان کا کیا بھی نہیں جا سکتا۔
چند لاکھ خوارج کے بعد ابتداء اسلام کی سیاسی کش مکش سے پیدا ہونے
والے اسلامی فرقوں میں کوئی فرقہ صحیح معنوں میں اگر باقی رہ گیا ہے تو وہ
شیعوں کا فرقہ ہے لیکن "شیعہ" کے اسی لفظ میں میرا خیال ہے کہ سیاسی
قصوں سے پیدا ہونے والے دینی فرقوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔

لفظ شیعہ کا مطلب

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو شیعہ کے اس لفظ سے جیسا کہ سب جانتے
ہیں مسلمانوں کا ایک خاص فرقہ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت اسلام کی
ابتدائی صدیوں کی سیاست کی یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے یعنی موجودہ
زمانہ میں "پارٹی" کے لفظ کا اس زمانہ میں تھا اسلامی تاریخ کا تھوڑا بہت
مطالعہ بھی جن لوگوں نے کیا ہے وہ اس سے واقف ہیں۔ مثلاً اس موقعہ
پر بے ساختہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کی ایک بات یاد آ گئی، عباسیوں
کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا، چاپلوس درباریوں
کی طرف خطاب کر کے ایک دن اس نے دریافت کیا۔
حجاج (مشہور ظالم امتی) کا وصیت نامہ کسی کو یاد ہے؟۔
دنیا کی عام تاریخ کے متعلق تو میں دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن مسلمانوں
کی تاریخ میں "ڈکٹیٹر شپ" کے طرز حکمرانی کا حجاج اپنے وقت میں شاید
سب سے بڑا امام تھا بنی امیہ کی حکومت کے حکمرانوں کو اسی لئے مطلق

"دارالتقیہ میں مسلمان عورتوں کا نکاح اپنی قوم کے ان افراد کے ساتھ جائز ہے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا مگر دارالعلانیہ میں اسکی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ صفحہ ۲۲ ج اتش ۔"

اور ان باتوں کی تفصیل کہاں تک کی جائے حد یہ ہے کہ اس قسم کے روشن خیال بھی ان ہی سیاسی چکروں سے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے تھے جو کہتے تھے کہ :۔

اسلام کے دینی اصطلاحات کی شرح مصلحت وقت کے مطابق کرنے کا ہمیں اختیار ہے ہو سکتا ہے کہ ہم کعبہ کے حج کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہیں کہ کعبہ عرب میں نہیں ہے بلکہ لعلہا بالہند بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہو ۔ صفحہ ۱۰۲ ج ا شہرستانی ۔

تشریح کے ان اطلاقی اختیارات کے ساتھ مسلمان صرف وہ اپنے آپ ہی کو سمجھتے تھے جو عوفی "غسانیوں" کا تھا جن کا لیڈر غسان الکوفی تھا ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خوارج جن کے متعلق سنا جاتا ہے کہ اب بھی ان کی تھوڑی بہت تعداد عرب کے بعض ساحلی علاقوں (مسقط عمان ، وغیرہ) میں پائی جاتی ہے اور مغرب اقصیٰ (مراکش وغیرہ) کے کوہستانی خطوں میں سیاحوں کا بیان ہے کہ قدیم خارجیوں کے نام لیواؤں سے ان کی ملاقات ہوتی تھی ، نہیں کہا جاسکتا کہ دور افتادہ گوشوں میں واقعی ان خارجیوں کی صحیح تعداد کیا ہے کچھ بھی ہو لیکن چند لاکھ تک بھی ان کی گنتی

وصیت نامہ کے عربی الفاظ جن کا ترجمہ میں نے درج کیا ہے ابو جعفر منصور نے ان کو سن کر دربار والوں سے کہا کہ:۔

ھٰذہ والله الشیعة لا شیعتکم — یہ ہے شیعہ نہ کہ تمہارے شیعہ

تاریخ دمشق: ابن عساکر ج ۲ ص ۱۲۰

مطلب یہ تھا کہ پارٹی کے ساتھ وفاداری کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زندگی و موت دنیا اور آخرت تک سب وفاداری کے جذبات میں غرق ہو جائیں۔ ابو جعفر کو اپنی پارٹی سے شکایت تھی کہ ہمارے شیعہ یعنی پارٹی میں وفاداری کا یہ بے پناہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔

میں ابو جعفر منصور کے ان ہی الفاظ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اس زمانہ کی ایک سیاسی اصطلاح اس سے سمجھ میں آتی ہے یعنی اہل بیت نبوت یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں کی پارٹی ہی کو شیعہ نہیں کہتے تھے بلکہ "شیعہ" کا لفظ عام تھا جس کی نسبت عباسیوں، امویوں، اہل بیت وغیرہ سب ہی کی طرف کی جاتی تھی۔ بنی امیہ کے حامیوں اور پارٹی والوں کو شیعہ بنی امیہ، عباسیوں کی پارٹی والے شیعہ بنی عباس کہلاتے تھے۔ جیسے شیعہ علی یا شیعہ اہل بیت ان لوگوں کی تعبیر تھی۔ جن پر اب مطلقاً "شیعہ" کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسی لئے تو پیش آئی کہ سارے مضاف الیہ جس کی طرف شیعہ کا یہ لفظ منسوب ہو کر استعمال ہوتا تھا یکے بعد دیگرے ختم ہوتے چلے گئے تا آنکہ "پارٹی" یا "شیعہ" ہونے کی حیثیت

اعلان ڈکٹیٹر کی حیثیت سے خود بھی مانتا تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی ان کو حکومت کا ڈکٹیٹر تسلیم کرلیں۔ اس باب میں ہلکی سی مخالفت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ واقعات کا ایک ذخیرہ اس باب میں تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اپنے اسی نقطۂ نظر سے مرتے ہوئے حجاج نے وصیت نامہ لکھوایا تھا جس میں کلمۂ شہادت کے بعد تھا:

"ولید بن عبدالملک (جو اس کے زمانہ میں بنی امیہ کا حکمران تھا)
اس کی فرمانبرداری اور طاعت کے سوا حجاج اور کچھ نہیں
جانتا۔ اسی عہد پر وہ زندہ رہا اور اسی پر وہ مرا اور اسی عہد پر
قیامت کے دن وہ اٹھے گا۔"

آمریت اور حجاج | ولید بن عبدالملک کے دریافت کرنے پر حجاج نے خود ہی کہا تھا کہ لبنان اور ثبیر، شام کا ایک پہاڑ، اگر ان دونوں پہاڑوں کے برابر زر خالص مجھے مل جائے اور سب کو خدا کی راہ میں خرچ کردوں جب بھی میری یہ نیکی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ جو میرے دل میں آپ کی طرف سے پائی جاتی ہے اس نے کہا کہ مسلمانوں کا جتنا خون بھی اس سلسلہ میں یعنی ولید کے لوگ مطیع ہو جائیں میں نے بہایا ہے اس خون کی نہ مجھے پرواہ ہے اور نہ اس کا خوف۔ اور لکھتا ہے کہ ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کو سختیوں میں ماخوذ کرا کے اس ظالم نے اسی سلسلہ میں قتل کرا دیا تھا کہا تھا کہ اللہ سے ڈرنے یعنی تقویٰ کے لئے تو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فرمایا گیا ہے لیکن اسی کے بعد وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (سنو اور اطاعت کرو) کے حکم کو قرآن نے استطاعت کے ساتھ مشروط نہیں کیا ہے۔ ص ۳۸۴ ج ۲ ابن عساکر۔

حاشیہ سابقہ صفحہ: ما بین المائتین والثلاث
حاشیہ صفحہ: مفتاح السعادۃ

سال تک رہا یعنی پہلی صدی سے اور تیسری صدی کے درمیان میں ۔

گویا تیسری صدی سے معتزلہ کا دور ختم ہونے لگا اور آج حال یہ ہے کہ بجز چند غیر کلامی کتابوں کے مثلاً زمخشری کی تفسیر کشاف یا لغت کی بعض کتابوں کے سوا دنیا کے کتب خانوں میں فرقہ معتزلہ کے مصنفین کی ان کتابوں کا ایک ورق بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے جو اعتزالی عقائد وخیالات کی تائید میں لکھی گئی تھیں کہہ چکا ہوں کہ آج اس فرقہ کے متعلق ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں وہ صرف اہل السنت والجماعت کی کتابوں کا صدقہ ہے کہ تردیدا جواب دینے کے لئے انہوں نے اعتزالی عقائد کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کر دیا تھا ۔

اور جب معتزلہ کا یہ حشر ہوا تو نسبتاً جن فرقوں کے پاس نہ معتزلہ کی قوت تھی نہ دولت، نہ علم نہ فضل، بھلا وہ بیچارے کیسے زندہ رہ سکتے تھے میرا تو خیال یہی ہے کہ جیسے جیسے نسلیں گزرتی گئیں ان کا تعلق قدرتاً ان اوہام وخرافات سے کمزور ہوتا چلا گیا جنہیں ان کے آباؤ اجداد اپنے ساتھ لائے تھے ۔ خالص اسلامی تعلیمات کی روح سے بہ نسبت اپنے اسلاف کے اخلاف زیادہ قریب ہوتے چلے گئے تا اینکہ وہ وقت بھی آ گیا کہ سارے موروثی رجحانات ان مسلم خاندانوں سے مٹ مٹا کر ختم ہو گئے ۔ اس راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں کا صرف نام ہی نام اب کتابوں میں رہ گیا ہے اس سلسلہ میں معتزلہ ہی کیا دنیا کے پردے پر کرامیہ مرجیہ جہمیہ وغیرہ وغیرہ ،

سے صرف وہی لوگ رہ گئے جو اپنے آپ کو اہل بیت اور حضرت علیؓ
کی پارٹی میں شمار کرتے تھے۔

اور یہی میرا مقصد ہے کہ "شیعہ" کے لفظ کا جو مفہوم اب ہو گیا ہے۔ یہ
خود بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی بے شمار سیاسی پارٹیاں پیدا ہو ہو کر ختم ہوتی
چلی گئیں پارٹیاں جنہوں نے مذہب کا چولا پہن لیا تھا انہیں دے کر صرف
ایک پارٹی اہل بیت کی حمایت کا دعویٰ کرنے والی باقی رہ گئی ہے۔ جن
کو ہم اب "شیعہ" کہتے ہیں۔

اور سیاسی راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں میں تو خیر شیعوں کا یہ
فرقہ باقی رہ گیا ہے لیکن اسلامی دین کے دائرے میں داخل ہونے والی
قوموں کے جن مذہبی الائشوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں جو فرقے پیدا
ہوئے تھے ان کا حال تو اس۔ سے بھی زیادہ عجیب ہے اور تو اور اس سلسلہ
میں سب سے زیادہ باتونی منہ زور قلم کے دھنی جتنی فرقہ معتزلہ کا تھا۔
جسے وقتاً فوقتاً عباسی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی رہی۔
بعض خلفاء پہ بھی اعتزالی رنگ چڑھ گیا تھا اور وزراء و قاضی القضاۃ وغیرہ
جیسے اقتداری عہدوں پہ بھی اس فرقہ کے فضلاء و علماءؔ قابض رہے ان کے
ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار اور تلوار کے ساتھ قلم بھی تھا معرکۃ الآراء کتابیں
اپنے خیالات و عقائد کی تائید میں اس فرقہ کے اہل قلم نے لکھیں یہ سب
کچھ ہوا مگر جیسا کہ طاش کبری زادہ کا بیان ہے نقل کر چکا ہوں۔

کان علم الکلام بایدی المعتزلۃ معتزلہ کے ہاتھ میں علم کلام کی باگ ڈور تھی

صدیوں میں جو کشمکش رہیں، یا باہر سے مختلف رجحانات کے جراثیم مسلمانوں
میں وقتاً فوقتاً جو منتقل ہوتے رہے اس سلسلہ میں اختلافات کی جو
صورتیں پیدا ہوئیں، رنگ کے بوقلموں شگوفے جو کھلے ان کے
تاریخی نمونے تو گزر چکے، عرض کر چکا ہوں کہ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا
اور ان ہی کی بدولت "ملل ونحل" کے موضوع پہ جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان
میں اسلامی فرقوں کی فہرست کافی طویل و عریض نظر آتی ہے، بہتر بہتر ہی
کیا گننے کے لئے کوئی بیٹھے تو شاید ان کی تعداد سیکڑوں سے بھی متجاوز ہو
جائے اسی لئے بہتر بہتر فرقہ والی زبان زد عام روایت کا مطلب بعضوں
کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی خاص عدد مراد نہیں ہے۔ بلکہ عربی زبان کے محاورے
کی بنیاد پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ فرقوں کی زیادتی و کثرت کی طرف اشارہ کیا
گیا تھا اس میں شک نہیں کہ پوری ہونے کی حد تک یہ پیشگوئی پوری
ہوئی اور کتابوں میں جن فرقوں کا اور ان کی اعتقادی و عملی خصوصیتوں کا
جو ذکر کیا گیا ہے، یہ فرضی واقعات نہیں ہیں۔

نہ سوچنے والے اسلامی فرقوں کی اسی ضخیم و کبیر فہرست کو دیکھ کر
گھبرا جاتے ہیں حالانکہ کتابوں کے اوراق سے ہٹ کر چاہیئے تھا کہ واقعہ
کی جو صورت اب ہو گئی ہے اس کا بھی جائزہ لیا جاتا، جتا چکا ہوں اور
جو چیز سامنے کی ہے اس کے لئے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر مسلمان
قوم یا امت اسلامیہ زمین کے اسی خاکی کرے کے باشندوں کا تو ایک
گروہ ہے۔ میں بار بار اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتا چلا آ رہا ہوں کہ شیعوں

کہاں مل سکتے ہیں ؟ اس لحاظ سے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے اور
یہی کہنا چاہیئے کہ ایشیا و افریقہ بلکہ یورپ و امریکہ کے انسانوں میں اسلامی
برادری ' قرآن کی بدولت جو قائم ہوئی ہے اور ستر کروڑ سے پچاس کروڑ
تک اس قرآنی برادری میں شریک ہونے والوں کی تعداد کا تخمینہ آج
جو کیا جا رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت میں شیعوں
کے سوا صرف ایک فرقہ اہل السنت والجماعت ہی کا باقی رہ گیا ہے اس
میں شک نہیں کہ خوارج کی طرح شیعوں کی تعداد ناقابل لحاظ نہیں ہے
لیکن جہاں تک میرا تخمینہ ہے اہلسنت والجماعت کے مقابلہ میں ہزار
میں ایک کی نسبت بھی شیعوں کی ثابت ہو جائے تو اس سے زیادہ بڑا
تخمینہ ان کے متعلق شاید کیا بھی نہیں جا سکتا ۔ گویا مسلمانوں میں ایسے فرقے
جن کے اختلافات بنیادی اختلافات قرار دئے جا سکتے ہیں لے دے کر
صحیح معنوں میں ان ہی دو فرقوں کے اندر منحصر ہو کر رہ جاتے ہیں اور خواہ مخواہ
کا بھی اضافہ اگر کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کے فرقوں کو
بہرحال تین سے زیادہ تو کسی طرح آگے بڑھایا نہیں جا سکتا ۔

باقی مسلمانوں میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ناموں سے جو کچھ
سمجھا جاتا ہے کیا اس کو "فرقہ بندی" کے نیچے ہم داخل کر سکتے ہیں ۔ آیئے
اس داستان کو بھی سن لیجئے ۔

سیاسی مفاسد و اغراض کی راہوں میں مذہب اور دین کے نام سے
ناجائز نفع اٹھانے والوں کی طرف سے نت نئی بازی گریاں اسلام کی ابتدائی

قریب نصف ارب سے زیادہ تخمینہ اس انسانی برادری میں شریک ہونے والوں کا کیا جاتا ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس وقت تک دنیا میں قائم ہو چکی ہے کیسی عجیب بات ہے کہ بھانت بھانت کی نسلوں، زبانوں، رنگوں کے باوجود ان کی سب سے بڑی اکثریت میں "سنی عقیدہ" اور طرز زندگی کے سوا کوئی دوسرا دینی رنگ نہیں پایا جاتا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دین میں ان سے جو ختلف ہیں عرض کر چکا ہوں کہ ان ہی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ ان کے پیغمبر نے اصلوت جو ان پر سلام ہو ان پر، اس انسانی برادری کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا ہے کہ اہل کتاب جن جن بزرگوں کو اپنے دینی پیشواؤں اور مذہبی راہنماؤں میں وہ شمار کرتے ہیں وہ نوح ہوں یا ابراہیم موسیٰ ہوں، یا عیسیٰ داؤد ہوں یا سلیمان زکریا ہوں یا یحییٰ (علیہم السلام) سب ہی پر ایمان لانا اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو اپنا دینی عقیدہ یقین کرتے ہیں جیسے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مانتے ہیں اس برادری کا ہر فرد اپنے آپ کو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ان بزرگوں کا صحیح وارث اور سب ہی کو نام لیوا بنا ہوا ہے ان کا قرآنی نعرہ ہی یہ ہے کہ

درد دل حق سر منشور نبیم ما   وارث موسیٰ و ہارون نبیم ما

ان کے خواص ہی کا نہیں بلکہ عوام کا بھی جزء ایمان یہی عقیدہ ہے ذکر کر چکا ہوں کہ بات صرف باطنی احساسات ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کے ساتھ رشتہ مناکحت کی اجازت بھی سارے آسمانی

کے سوا بمشکل ہزار میں ایک کی نسبت عام مسلمانوں کے ساتھ رکھتے
ہیں اس لئے خود شیعوں کی عام فقہی اور دینی کتابوں میں غیر شیعی مسلمانوں
کی تعبیر ہی "العامہ" کے لفظ سے کی گئی ہے ۔

پس ان شیعوں کے سوا بتایا جائے کہ اہلسنت والجماعت یا عوام
جن کو سنی مسلمان کہتے ہیں اب مسلمانوں میں دنیا کے اس پردے پر صحیح
معنوں میں دیکھئے تو سنی نہیں کسی فرقہ کا پتہ بھی ہے؟ ۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ اسلام کے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ
والتسلیمات کا کوئی دوسرا کارنامہ نہ بھی ہوتا تو یہی عجیب و غریب معجزہ اس
کامیابی کہ کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص نسل کے لوگوں میں نہیں بلکہ
عام بنی نوع انسانی میں ایک ایسی عظیم الشان طویل الذیل برادری آپ کے
طفیل میں قائم ہوئی جس میں سامی نسل والے بھی شریک ہیں اور وہ بھی جن
میں آریوں کا خون ہے تاتاری بھی ان میں ہیں اور منگولی بھی، حبشی بھی
ہیں اور سوڈانی بھی، ایشیائی بھی ہیں اور افریقی بھی، بلکہ کافی تعداد یورپ
کے باشندوں کی بھی ہے اور امریکہ کی جدید دنیا بھی ان سے خالی نہیں ہے
الغرض ان میں گورے کالے گندمی، پیلے سب رنگ کے آدمی دینی
یک رنگی کے رشتہ کو قائم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے
عالمی اخوت اور برادری کا یہ دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا
رہا ہے ۔

یہی سوچنے کی بات ہے کہ دس بیس لاکھ کی تعداد میں نہیں بلکہ قریب

یہ واقعہ آپ کو مل جائے گا کہ :

لما قدموا على رسول الله صلى الله عليه وسلم ضرب عليهم قبة في ناحية المسجد — جب ثقیف کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا جس میں وہ ٹھیرائے گئے۔

حـ ج ۴ زرقانی

حالانکہ خیمہ قائم کرنے کے لئے مدینہ میں بہت جگہ کی کوئی کمی نہ تھی لیکن مسلمان تو مسلمان اہل کتاب تک طائف والے نہ تھے۔ لات نامی بت کے پجاری تھے اور وہ سب کچھ تھے جو جاہلیت میں عرب کے عام مشرک ہو سکتے تھے لیکن باوجود اس کے ان کا مسجد نبوی کے ایک ناحیہ اور گوشہ ہی میں تو خیمہ نصب کیا گیا۔ شمس الائمہ سرخسی نے شرح سیر کبیر میں اسی روایت کا ذکر کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ بعضوں نے کہا بھی کہ یہ لوگ تو ناپاک ہیں جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ليس على الارض من نجسهم شيء — ان کی ناپاکی کا زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

شرح سیر ص ۹۲ ج ۱ .

حق تو یہ ہے کہ بات کچھ مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ آج اپنا وطن ہندوستان ہے، اس میں "حیات بہار" کی چھوتریوں سے انسانیت تو ذبح کی گئی تا آنکہ ان گنت طبقات میں یہاں کی آبادی بٹ گئی۔

ادیان کی تصدیق و توثیق کرنے والی اس انسانی برادری کو دی گئی اسی اجازت
کے مطابق عمل بھی جاری ہے۔

مسجد نبوی میں عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت رسول صلعم

اور یہ رشتہ تو خیر گویا ایک دنیاوی تعلق کی شکل ہے، دین اور دین کا بھی سب سے اہم امتیازی عنصر عبادت ہوجاتا ہے تک کی اجازت خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی عبادت گاہ بلکہ اصل مسجد اقدس میں دی جو کعبہ کے بعد مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی مسجدوں اور عبادت گاہوں میں سب سے زیادہ احترام کی مستحق ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ نجرانی عیسائیوں کا جو وفد دربار نبوت میں حاضر ہوا تھا۔ صحیح روایتوں میں ہے کہ ان عیسائیوں نے مدینہ منورہ کی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے

صلوا الصلاۃ نحوہم (زاد المعاد جلد ثانی) اپنے طریقے سے نماز پڑھی یعنی عبادت کی

لوگ سوچتے نہیں ورنہ رحمۃ للعالمین کی رحمت کا دامن تو اس سے بھی زیادہ فراخ اور وسیع تھا۔ ثقیف کے بت پرست مشرکین کا وفد

طائف والوں کو مسجد میں ٹھیرایا گیا

طائف سے جب مدینہ پہنچا تو دیکھئے سیرت طیبہ کی عام کتابوں میں

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں، دیکھ رہے ہیں آگے پیچھے دائیں بائیں بھی تماشے
ہمارے سامنے آئے دن گزرتے رہتے ہیں اس لئے فقہ اسلامی کی ہر
چھوٹی بڑی کتاب میں یہ پڑھ کر گزرتے بھی رہتے ہیں کہ،

سؤر الآدمی مطلقا ولو کافرا — آدمی کا جھوٹا پاک ہے خواہ کسی قسم کا آدمی ہو
طاهر طهور بلا كراهة — کوئی ہو کافر و غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو بغیر کسی ناپسندیدگی کے
شامی ص ۱۵۰ ج ۱ — اس کو پاک سمجھنا چاہئے۔

اور کیا یہ پانی صرف خود پاک ہے؟ سنئے مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ،

أي مطهر لغيره من الأحداث — خود بھی وہ پانی پاک ہے اور دوسروں کو بھی پاک
والأخباث (شامی ص ۲۰۵-۱۵۰) — کرتا ہے ہر قسم کی ناپاکیوں اور گندگیوں سے۔

مطلب جس کا یہ ہوا کہ اس پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنا، قرآن چھونا
سب کچھ درست ہے۔

ہم گزر جاتے ہیں، اور کچھ اندازہ نہیں کرتے کہ ترقی جوئی انسانیت کو
اس کے آخری جوڑنے والے نے جوڑتے ہیں اپنی سرگرمیوں کو کہاں تک پہنچا
دیا تھا، چھونا۔ ایسے آدمی کا چھونا جو مسلمان نہیں ہے اس کو مسلمان صرف
کھا پی ہی نہیں سکتے ہیں بلکہ ایسے جھوٹے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھ بھی
لا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین نے آدم کے بچوں کو کھڑا کر دیا
صلوٰت جہان پر اسلام ہو، ان پر اللہ اللہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی،
انسانیت کے اس سب سے بڑے بہی خواہ کا خیال آتا ہے اور
آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، ان قدموں پر نہ لوٹئے تو آخر کس پر لوٹئے، جس

چھوت چھات کا مقابلہ اسلامی نقطہ نظر سے

بٹ گئی اور کس حد تک یہی کہ باوجود آدمی ہونے کے دوسرا آدمی
بھی یہ سمجھتا ہے اور سمجھ کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے کہ اس کے چھو
جانے سے وہ ناپاک ہو جائے گا کتے چھولیں بلیاں چھولیں گھوڑے چھولیں
آدمی پھر بھی پاک ہی رہتا ہے لیکن آدمی آدمی کو چھولے اچھونے والا اور
جو چھوا گیا دونوں ناپاک ہو گئے چھونے سے ان کا کھانا ناپاک ہو جاتا
ہے۔ پانی ناپاک ہو جاتا ہے قیمتی سے قیمتی چیزیں اس احساس کے زیر
اثر آئے دن برباد ہوتی رہتی ہیں پھینک دی جاتی ہیں سمجھ لیا جاتا ہے
کہ کوڑی کام کی نہ رہیں اس ذہنی تاثر کے لئے نہ نسلوں کے اختلاف کی
ضرورت ہے نہ ملکوں کے اختلاف کی نہ زبانوں کے اختلاف کی نہ رنگوں
کے اختلاف کی حتیٰ کہ دینی اختلاف کی بھی ضرورت نہیں ایک ہی نسل ایک
ہی ملک ایک ہی زبان کے بولنے والے ایک ہی رنگ والے بلکہ دینی
حیثیت سے جس نام سے چھونے والا پکارا جاتا ہے اسی دینی نام سے
چھو جانے والا بھی موسوم ہوتا ہے الغرض چھونے والا بھی اپنا دھرم وہی
بتاتا ہے جو دھرم چھوئے جانے والے کا ہے یا یہ کہ "چھو جانے" کے
قانون کے تحت اگر اس کا چھونا بھی داخل ہے تو ناپاک ہو جانے اور
ناپاک کر دینے کے لئے باہمی مساس یا چھوا چھوت ایک دوسرے کا کافی
ہے۔

نے خاک سے اٹھا کر آدم کی اولاد کو کاخ تک پہنچا دیا۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

کا نعرہ لگاتے ہوئے مسلمانوں نے زمین کے مختلف حصوں کو آناً فاناً اپنا وطن بنا لیا، اور وطن بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔ کیا چھوت چھات کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے بعد بھی اس میں وہ کامیاب ہو سکتے تھے۔

قومیں ابھی سوچ رہی ہیں کیا بچھڑے ہوئے باہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کی تجویزیں بھی پاس کر رہے ہیں آمادہ کیا جا رہا ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو آدمی سمجھے، اپنا بھائی خیال کرے۔

لیکن جو کچھ سوچا جا رہا ہے وہ سب کچھ کیا جا چکا اور یقین مانئے کہ جو کچھ بھی آئندہ ہوگا وہ "وحدت انسانی" اور انسانیت کے احترام کے اسی پیغام کی تعمیلی شکل ہوگی۔

اہلسنت والجماعت میں کوئی فرقہ نہیں ہے

خیر میں بہت دور نکلا چلا جا رہا ہوں ورنہ بات کہنے کی آخر میں جو رہ گئی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے جس طبقہ کی تعبیر اہل السنت والجماعت یا سنی مسلمانوں سے میں کر رہا ہوں ان سے متعلق نہ جاننے والوں پر شاید میرا یہ دعویٰ گراں گزر رہا ہوگا کہ سنی مسلمانوں میں دینی اختلاف یعنی ایسا دینی اختلاف نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک کے دین کو سمجھا جائے کہ دوسرے کے دین سے جدا ہو گیا قرآنی تعبیر میں کہہ سکتے ہیں کہ۔

رشتہ کو قائم کرنا ہو وحدت انسانی... کے نظریہ کا اگر کوئی نصب العین اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہی ہو سکتا ہے۔

اب آئیے اور دیکھئے کہ نصف ارب سے زیادہ تعداد والی برادری مسلمانوں میں جو اہل السنت والجماعت کے نام سے پائی جاتی ہے ان سنی مسلمانوں میں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض علاقوں کے مسلمان حنفی کہلاتے ہیں اور بعض کے شافعی۔ ان میں کچھ مالکی کے نام سے موسوم ہیں اور ان ہی میں بعضوں کو حنبلی بھی کہتے ہیں۔ بلاشبہ سنی مسلمانوں میں ان چار ناموں کے مسلمان پائے جاتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ صرف نام ہی کا یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ ان چاروں طبقات کے دینی کاموں میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں اور کوئی اختلافات لیکن سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد پر سنی مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے دین کو کیا دوسرے گروہ کے دین سے کبھی کسی زمانہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی جدا کیا یا جدا سمجھا ہے؟۔

خود ان بزرگوں کے باہمی تعلقات اور ان کے اندرونی حسن سلوک سے جو ناواقف ہیں جو نہیں جانتے کہ امام شافعیؒ امام مالکؒ کے تلمیذ رشید تھے یا احمد بن حنبلؒ امام شافعی کی رکاب تھام کر بغداد کے بازاروں میں گھومتے تھے۔ امام شافعیؒ نے ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی سے کتنا سیکھا اور کیا کیا سیکھا۔ امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر پہنچ کر امام شافعی نے کیا کیا تھا۔ ان ناواقفوں کو کم از کم اس کا تو اندازہ کرنا چاہئے کہ حنفی مسلمان جب امام شافعی کا ذکر کرتا ہے تو امام ہی کے لفظ سے ان کا ذکر

مجرموں میں بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشانات ہر ایک کے اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ عدالتیں اپنے فیصلوں میں "نشان ابہام" کے ان ہی فطری امتیازات پر اعتماد کرتی ہیں۔

اور یہ حال باہر کا ہے یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ نازک نوعیت ہماری فطرت اور طبیعت کے اندرونی رجحانات و میلانات کی ہے بالکل ممکن ہے کہ مذاق و مزاج میں دو آدمیوں میں اتحاد ہو۔ اتنا اتحاد ہو کہ ۹۹ فی صدی اشتراک لحاظ اس باب میں دونوں کے متحد ہوں لیکن یقین کیجئے کہ آخر میں کوئی نقطہ دونوں میں اختلاف کا بھی ہوگا تجربہ یہی بتاتا ہے یعنی پھل کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کا جو طریقہ ہے اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اور درخت سے جو پھل کو پہچانتے ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ فطرت کے خالق نے گلاب کی ایک پنکھڑی بھی ایسی نہیں بنائی جو بعینہ دوسری پنکھڑی جیسی ہو تجلیات میں تکرار نہیں ہے یہی صوفیوں کا بھی مسلّمہ ہے اور۔

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

ہمارے فلسفی شاعر کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

پس یہ خیال کہ سارے انسانی افراد میں ایسی وحدت اور یگانگی پیدا ہو سکتی ہے کہ ظاہراً و باطناً کسی قسم کا اختلاف ان میں باقی نہ رہے یہ قدرت سے قدرت کے قانون سے جنگ کا ارادہ ہوگا۔

لیکن ان ہی غیرارادی فطری اختلافات کے غیرارادی اتحاد کے

روایت کرنے والے بزرگوں کے علم و فہم کے اختلاف سے روایتوں میں تھوڑا بہت اختلاف پیدا ہوا ابتداء اسلام میں ان روایتوں کو جن لوگوں نے منقح کرنا چاہا اور اس کے ساتھ اسلامی کلیات سے جو نتائج حسب ضرورت نکلتے رہے ان میں نتیجہ نکالنے والوں کے علم و فہم کے اختلافات سے بھی اختلاف کی ناگزیر صورتیں جو پیش آئیں ۔ کلیۃً اندر کی ان ہی دو باتوں پر بہرحال اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے ۔

یوں تو اس راہ میں کام کرنے والوں کی کافی تعداد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پائی جاتی تھی لیکن گھٹتے گھٹاتے رہتے مثلاً کو چار بزرگوں کے خدمات کو مختلف اسباب و وجوہ سے غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا کتابوں میں ان کے تنقیح شدہ نتائج مدون ہوئے امت میں ان ہی کتابوں کی اشاعت ہوئی اور ان ہی کے اعلام کی طرف چار دل طریقوں میں سے ایک ایک طریقہ منسوب ہے امام ابوحنیفہؒ کے مکتب خیال کے ماننے والے حنفی محمد بن ادریس شافعیؒ کے ماننے والے شافعی ، امام مالکؒ بن انس کے ماننے والے مالکی ، احمد بن حنبلؒ کے ماننے والے حنبلی کے نام سے موسوم ہوئے ۔

یہ ہے خلاصہ سنی مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے قصوں کا ۔

اور یہ تو خیر ماہیانہ اشارے ہیں ۔ واقعات سے جو تا واقف ہیں ان کو صرف چونکانا مقصود ہے اپنے معلومات کا وہ خود جائزہ لیں ۔ دیکھیں کہ ان بزرگوں کے ماننے والے مسلمانوں کے اختلاف کی واقعی نوعیت کیا ہے ۔

کرتا ہے امام مالک کا نام امام کے لفظ بغیر لے نہیں سکتا امام احمد حنبل کی
داستان صبر و ابتلا کو سن کر حنفی مسلمان بھی اسی قدر متاثر ہو جاتا ہے جتنا
متاثر خود کوئی حنبلی مسلمان ہو سکتا ہے اور یہی کیا کون نہیں جانتا کہ تمام حنفی
مسلمانوں کے نزدیک خدا رسیدہ بزرگوں میں احترام کا جو مقام ایک حنبلی بزرگ
کو حاصل ہے یعنی غوث اعظم قطب الاقطاب حضرت شیخ عبد القادر جیلانی
رحمۃ اللہ علیہ وہ حنبلی تھے یا حجۃ الاسلام غزالی فخر الاسلام رازی باوجود شافعی
المذہب ہونے کے حنفیوں کے بھی مالکیوں کے بھی حجۃ الاسلام اور فخر الاسلام
ہیں جلال الدین رومی حنفی ہونے کے باوجود سارے اسلامی طبقات میں
میں مقبول ہیں۔ مجدد الف ثانی کو ہندوستان میں تو صرف حنفی مسلمان
دین کا مجدد تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندوستان سے باہر نکل کر عراق میں، شام
میں عرب میں لاکھوں لاکھ کی تعداد میں شوافع مالکیہ حنابلہ حضرت مجدد رحمۃ
اللہ علیہ کے ماننے والے آپ کو مل جائیں گے۔

سچ پوچھئے تو دینی اختلافات کا بھی رنگ مسلمانوں میں ایسا ہے جسے نہ
سیاسی عوامل و موثرات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ باہر سے درآمد شدہ تراجم
سے اس کا تعلق ہے بلکہ صحیح معنوں میں اندرونی اسباب ہی پر اس کی بنیاد تو ہے
کچھ روایات اور زیادہ تر اسلامی کلیات کے تفصیلی نتائج اور استنباطی
مسائل کے اختلاف سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔

الکتاب یعنی قرآنی مطالبات الصلوۃ الزکوۃ والصوم والحج وغیرہ وغیرہ
کی تعمیلی شکلوں کو کر کے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دکھایا تھا ان کی

بن المسیب پڑھوں گا۔

مطلب آپ کا یہ تھا کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا یہی فتویٰ سعید بن المسیب کا تھا۔ ساری امت میں صحابہؓ کے بعد ان ہی کو بعضوں نے افضل التابعین قرار دیا ہے پھر کیا ان کے پیچھے نماز درست نہ ہوگی حاصل یہ ہے کہ گو خود امام کی تحقیق یہی تھی کہ خون نکلنے سے وضو ساقط ہو جاتا ہے لیکن بایں ہمہ جو کہتے تھے کہ نہیں ٹوٹتا ان کو بھی برسر غلطی نہیں سمجھتے تھے بلکہ خیال یہی تھا کہ تحقیق سے وہ اسی نتیجہ تک پہنچے ہوں گے لیکن دین تو ہم سب کا ایک ہی ہے اور یہی دستور مسلمانوں میں شروع سے چلا آ رہا تھا شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ۔

"سارے صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے شاگرد تربیت یافتہ حضرات (اور ان کے بعد بھی) بزرگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوئی بسم اللہ کو منہ میں پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا ــــــــ کوئی فجر میں قنوت کی دعا پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا کوئی پچھنا لگانے اور نکسیر پھوٹنے سے وضو کے ٹوٹ جانیکا قائل ہے کوئی نہیں اس قسم کے بیسیوں اختلافی مسائل کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

مع هذا کان بعضهم یصلی خلف بعض (ص ۳۵۷ ج ۲)

باوجود ان کے ان میں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔

ان تاریخی شواہد کی تفصیل کے لئے چاہیئے کہ میرا مقالہ تدوین فقہ کا مطالعہ کیا جائے جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خود امام مالک نے ایک سے زیادہ دفعہ عباسی حکومت کے تعلق سے اس ارادہ سے روکا کہ امام مالک ہی کے فقہی نتائج کا سارے مسلمانوں

حد تو یہ ہے کہ "تعلیم و تعلم" اور وہ بھی دین کی تعلیم و تعلم ، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر "دینی تربیت" کے سلسلہ میں پیری و مریدی کے تعلقات میں بھی مسلمانوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ جس سے ہم دینی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا دینی تربیت کے لئے مریدی کا رشتہ قائم کر رہے ہیں ، وہ حنفی ہے یا شافعی ، مالکی ہے یا حنبلی ۔ بس جس کے پاس دین کا علم پایا گیا اور جس کی صحبت میں دیکھا گیا کہ لوگ دین دار بن جاتے ہیں ان سے علم بھی مسلمان ہمیشہ حاصل کرتے رہے اور دینی تربیت بھی ان سے پاتے رہے ۔ اول سے آخر تک مسلمانوں کی یہی تاریخ رہی ہے ۔

یہی کیا ، جاننے والے جانتے ہیں کہ تدبروفی اختلافات کے ان قصوں میں بسا اوقات یہ صورت بھی پیش آئی ہے کہ کسی امام کے نقطۂ نظر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن دوسرے امام کے نزدیک نہیں ٹوٹتا ۔ مثلاً بدن سے خون نکلے یا نکسیر پھوٹی پچھنا لگا یا گیا ۔ بایں ہمہ اول سے آخر تک ہر طبقہ کے مسلمان دوسرے طبقہ کے امام کے پیچھے نمازیں پڑھتے چلے آئے ہیں ابن تیمیہ نے اپنے فتاوے میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل جو قائل تھے کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ، بغیر تازہ وضو کے نمازی کی نماز درست نہ ہوگی ، باوجود اس کے ان سے کسی نے پوچھا کہ ایسا آدمی جس کے بدن سے خون نکلا ، وہ وضو کئے بغیر نماز پڑھ رہا ہو تو ہم اس کے پیچھے کیا نماز پڑھ سکتے ہیں ؟ غضب ناک ہو کر پوچھنے والے سے امام احمد نے فرمایا کہ ۔

کیف لا اصلی خلف سعید بن (یعنی سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیسے نہ

مشکلات میں مسلمانوں کے لئے ان ہی اختلافات کی بنیاد پر آسانی کی صورتیں
پیدا ہوتی ہیں۔ استدلال میں فتاویٰ تاتارخانیہ سے جو ہندوستان میں تاتارخان
تغلقیوں کے وزیر کے حکم سے مدون کیا گیا تھا۔
اس کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ

فان فی اختلاف [illegible] توسعۃ للناس [illegible] — ائمہ میں جو اختلاف ہے [illegible] لوگوں کے لئے وسعت و آسانی پیدا ہوتی ہے۔

حالانکہ پچھلے زمانہ کے فقہاء سخت گیری اور تشدد میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔
لیکن شامی کتاب میں جیسے فخر الائمہ صاحب معراج الدرایہ کے اس قول
کو نقل کر کے سراہا ہے کہ

"فقہاء کے مختلف اقوال میں سے کسی قول پر مسلمانوں کی آسانی کے
لئے ضرورۃً فتویٰ دیا جائے تو یہ اچھی بات ہوگی (شامی ج ۱)"

مطلب یہی ہے کہ بظاہر وہ قول ضعیف اور مرجوح ہی کیوں نہ ہو، لیکن
دشواری میں کوئی مسلمان اگر مبتلا ہو گیا ہو تو ایسے موقع پر ضعیف اور مرجوح اقوال
کی پشت پناہی میں اس مصیبت زدہ کی امداد دینا کے لئے باعث ثواب ہوگا۔
بہرحال تفصیلات کے لئے مطولات اور بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے،
خصوصاً علامہ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب میزان کبریٰ کا مطالعہ ان لوگوں کے
لئے مفید ہوگا جو ان ہی فقہی اختلافات کو تذکرہ کر کے دین سے دلوں میں بیزاری
پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مقالہ جو تھانہ بھون کے سیرت کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا
تحقیقات علمیہ میں شائع ہو چکا ہے اس باب میں اس کو بھی پڑھئے تو

لیکن با ایں ہمہ اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا کہ خاص حالات کے زیر اثر کبھی کبھی تاریخ کے طویل دور میں مسلمانوں پر ایسے ہیجانی دورے ہوتے رہے ہیں یہ دیکھا گیا ہے کہ روح سے بے تعلق ہو کر سیاست و انتظام کو کوئی طبقہ گروہ دین کے صرف بیرونی خط و خال و نوک پلک کے متعلق رہتے ہوئے بے جا اصرار کر رہا ہے یعنی غلو میں بڑھتے ہوئے اس سلسلہ میں اس حد تک پہنچ گیا کہ عام مسلمانوں کیلئے اس گروہ کا وجود باعث فتنہ و فساد تفرقہ و شقاق بن گیا۔ سمجھا جاتا ہے والے ہونا اس کی ذمہ داری بجز اختلافات کے قصوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

حالانکہ سچ پوچھیے تو ہمارا دنیا میں کچھ لوگ ایک خاص قسم کے نفسیاتی مرض اور ذہنی روگ کے شکار ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بہ قسمت سے کہیں کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں مثلاً کامیاب ہوگئے تو ان کی زندگی سمٹ کر گویا اسی ملازمت اور ملازمت کے قصوں میں کھپ جاتی ہے سرکاری ملازم کے جو فرائض ہیں ادا کرنے پر کچہری میں آدمی حاضر ہو خدمت جو اس کے سپرد کی گئی ہے دیانت و امانت کے ساتھ اس کے حقوق ادا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ کچہریوں کا ملازم صرف کچہریوں کا ملازم ہی نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کا باپ بھی ہے بیوی کا شوہر بھی ہے عزیزوں اور قریبوں کا رشتہ دار بھی ہے سوسائٹی کا ایک فرد بھی ہے الغرض کچہری کی زندگی کے سوا اور بھی بیسیوں شعبوں سے اس کا تعلق ہے لیکن مذکورہ بالا نفسیاتی روگ کے بیماروں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی ملازمت دفتر کی کرسی و میز تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اپنی بیوی بچوں میں بھی سرکاری ملازمت کا شعور ان کا گلا پکڑے رہتا ہے ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی وہ سرکاری ملازم کے سوا

اور کسی شعور کو اپنے اندر نہیں پاتے۔ جاگتے بھی ہیں تو اسی تصور کے ساتھ کہ حکومت
کا ہمیں عہدہ دار ہیں اور سوتے بھی ہیں تو اسی خیال کے ساتھ سوتے ہیں الغرض
زندگی کا کوئی لمحہ اس احساس سے ان کے ذہنوں کا خالی نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر یہ بھی
دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنی ملازمت کے حقیقی فرائض کی تکمیل
سے قاصر ہوتے ہیں۔ آخر دفتر کے باہر بھی جو سرکاری ملازم ہی بنا رہتا ہو تو دفتر
کے اندر پہنچ کر اپنے فرائض کا شعور اس میں کہاں ابھرتا۔ اور اندر پہنچ کر بھی وہ باہر
رہتا ہے تو اس قسم کی ذہنیت کا انجام عام حالات میں یہی ہونا چاہیئے۔

ایک نفسیاتی روگ

مذکورہ بالا نفسیاتی مرض کے مریضوں میں سے کسی کا ذہنی رشتہ کسی وجہ سے
مذہب یا دین کے ساتھ جب قائم ہو جاتا ہے اس کے تماشے بھی عجیب ہوتے
ہیں اچانک اپنے ہم مذہب افراد کی عمومیت سے دیکھا جاتا ہے کہ اچک کر باہر
ہو گیا جو کچھ سب جانتے ہیں وہی وہ بھی جانتا ہے جو کچھ سب جانتے ہیں وہی
سب کچھ وہ بھی جانتا ہے لیکن اس نفسیاتی بحران کے زمانہ میں چشم و ابرو کے ہر
اشارہ سے یہی نمایاں کرتا ہے کہ دین اور دینیات کے سوا اس کے اندر کچھ باقی نہ رہا
ہے اور نہ باہر حرکت ہو یا سکون نشست ہو یا برخواست ہر شکل میں ایسا معلوم
ہوتا ہے اور شاید دوسروں کو وہ یہی معلوم بھی کرانا چاہتا ہے کہ براہ راست خدا
سے اسی کا تعلق قائم ہے مذہب کے واحد اجارہ دار اور دین کے تنہا ٹھیکہ دار
کی شکل میں اپنے آپ کو وہ نمایاں کرتا ہے اور یوں اپنے متعلق طرح طرح کی

رہا کچھ تھوڑا بھی تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اصل دین ہی کا قصہ والعیاذ باللہ ختم نہ ہو جائے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں زوالِ حکومت کے بعد ذہنی اختلال اور اس کے نتائج

بہرحال یہ کہنا چاہتا تھا کہ بجائے خود اندرونی اختلافات کے ان قصوں کی
کوئی اہمیت نہیں ہے جتنی اہمیت کبھی نہ [illegible] مغربوں کے [illegible] طبقہ نے ان کو جتنا کچھ
اور حد سے زیادہ خوفناک بنا دیا جیسا کہ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں
زوالِ حکومت سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کے [illegible] میں دیکھا گیا تھا۔ لوگ تو ان
تھک کر بیٹھ [illegible] سے یہ سمجھ لیا گیا جو حاکم تھے وہ محکوم بن گئے جن کا سب کچھ تھا ان کا کچھ باقی نہ
رہا پھر کچھ تو مذہب کے ان ہی فروعی مسائل کے سلجھانے میں مشغول ہوئے شاید ان کا
احساس تھا کہ ان ہی مسائل سے غفلت کی سزا مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے دی گئی
ہے لیکن سلجھانے کی [illegible] کوشش مسائل کو الجھاتی ہی چلی گئی بعضوں نے تقریر کے ساتھ
ساتھ تحریروں کے تصوف کو بھی اسی لئے ختم کر دینے کا تہیہ کیا اور دعوت دینے لگے کہ
عذابِ الٰہی کے ازالہ کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی کتاب
چنانچہ مسلمانوں کو جمع کر دیا جائے مگر عمل کا جب وقت آیا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جو لغت یا قصہ
کی کتاب کے ساتھ تحقیق کرنے والوں کا یہ طبقہ مسلمانوں کو اپنے اندر ہی جمع کرنے لگا قرآن کے
ساتھ ضروری قرار دیا گیا کہ قرآن سمجھنے والوں کے حاشیوں اور تحقیقوں پر بھی ایمان لایا جائے۔

اسی سلسلہ میں بعضوں نے تو قرآن کے ساتھ ساتھ خود اپنے اور اپنے ہوائی وحیوں
پر بھی ایمان لانے کی دعوت حکومت سے محروم ہونے والے مسلمانوں کو دینا شروع

فیصلہ طلب کرنے کیلئے حاضر ہونا پڑا۔ دین اسلامی کے اختلافی مسائل کے استعمال
کی یہ ایک بدترین شکل تھی جو دین کے متعلق اسی قسم کے نازک احساسات والوں
کے غلط طریقۂ عمل کی پیداوار تھی۔

اسلام کی روح اور دین کے مغز سے بیگانہ ہو کر صرف اسی پر لڑ رہے تھے
کہ گو آہستہ آمین کہنا بھی حدیثوں سے ثابت ہے لیکن زیادہ قوی حدیثوں سے
ان کا دعویٰ تھا کہ زور سے آمین کی آواز کا منہ سے نکالنا ہی بہتر ہے یا بجائے
ناف یا زیر ناف کے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا خیال کرتے تھے کہ زیادہ اچھا
ہے رکوع میں جاتے ہوئے یا اس سے اٹھتے ہوئے کوئی۔ دونوں ہاتھوں کو نہ
اٹھائے تو وہ بھی کہتے تھے کہ اس کی نماز ہو گئی تاہم اٹھانا ہاتھوں کا کہتے تھے کہ
زیادہ ثواب کا کام ہے یہ سب کچھ ماننے کے باوجود ان ہی چند مسئلوں میں جو غلو
خیال سے ہو رہے ہنگامے مچائے گئے علگ جنسانیاں ہوئیں وہ بڑی دردناک
داستان ہے فقہی اختلاف کے غلط استعمال کی یہ بڑی ہولناک تاریخی مثال ہے۔

اور گو اب یہ جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا چلا جا رہا ہے لیکن دین
کے صحیح احساس کا نتیجہ شاید ہم اسکو بھی قرار نہیں دے سکتے وہ تو جو کچھ ہو رہا تھا دینی
احساس کی شدت کا نتیجہ تھا اور اب جو کچھ دیکھا جا رہا ہے دینی احساس سے بیگانگی
کی یہ پیداوار ہے۔ جیسے جیسے مغربی تمدن کا اثر عالمگیر ہوتا جا رہا ہے دین کے فروعی
مسائل تو خیر دور کی چیزیں ہیں خود اصل دین ہی سے لوگ بے تعلق ہوتے چلے جا رہے
ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا زوال حکومت کی چوٹ سے
کچھ چونک پیدا بھی ہوئی تو اس چونک و تنبیہ کا رخ نااختلافی مسائل کی طرف پھر گیا ادھر

عیاران ذہن بھی شریک ہو گئے ہوں۔

بہرحال ہندوستان میں دینی جھگڑوں کے یہ تماشے جو دیکھے گئے دین کے صحیح احساس پاس کی بنیاد یقیناً نافرض تھی۔ اب خواہ تہہ میں ان کے دینی نفسیاتی مرض ہو یا شکم کے تقاضے پوشیدہ ہوں۔ تاہم یہ بھی قطعاً بہتان اور افترا ہے کہ بانٹنے والوں نے مسلمانوں کو کلیتہً فقط اپنے پیٹ میں کچھ ڈالنے کیلئے ہی بانٹا تھا بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثریت اس جرم سے اپنا حسن ظن تو یہی ہے کہ عموماً بری اور پاک تھی۔

شکم پروری کے لئے دینی جھگڑوں کی پیدائش

لیکن پیٹ کے لئے ناواقف مسلمانوں کو کبھی بانٹا نہیں گیا ہے۔ یہ بھی کلیتہً درست نہیں ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے فہیم وذکی۔ ماہر سیاح مفسر سیاح علامہ مقدسی ہیں۔ انہوں نے سیاحت کے بعد سفر کی یادداشتوں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب بھی کر دیا تھا۔ کتاب یورپ میں طبع ہو کر شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سارے اسلامی ممالک جن میں مقدسی گھومے ہیں وہاں کے مسلمانوں کے دینی رجحانات کا بھی تذکرہ کرتے چلے گئے ہیں خراسان میں جب پہنچے تو لکھا ہے کہ

"حنفی مسلمانوں کو دیکھا کہ ان کو لوگ یہاں معتزلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور شافعیوں نے اپنے آپ کو حدیثیہ کے نام سے مشہور کیا ہے"۔

آگے ان ہی کا بیان ہے کہ:۔

بینھما عصبیات یھرق فیھا	حنفیوں اور شافعیوں میں والہانہ تعصبات
الدماء و یدخل بینھما	قائم ہیں اسی تعصبات اسی لئے ان میں خون ریزیاں بھی ہوتی ہیں

کیا کھوئی ہوئی حکومت کے ملنے کی واحد شکل یہی قرار دی گئی کہ محمد رسول اللہ کی وحی
کے ساتھ جدید وحی کی روشنی حاصل نہ کی جائے۔ گویا محمدی رسالت ناکافی ٹھہرائی گئی
اور قرآن وحی جو آسمان سے اتری تھی ذیلی وحیوں میں قرآن ہی کی رو سے آخری وحی تھی
اس کے بعد بھی نئی اور جدید وحی کے نزول کا دعویٰ بے شرمی سے کیا گیا یا ماننے والوں نے
خدا پر جھوٹ باندھا۔ بہرحال یہی خفقانی دورے تھے جو مختلف شکلوں میں دلوں
اور دماغوں پر مختلف شکلوں میں پڑتے رہے اور یہ سب جو کچھ بھی ہوا زیادہ تر ان ہی
لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو عام مسلمانوں کے مقابلہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ کسی اختصاصی رشتہ کے مدعی بن بیٹھے تھے دین کی بے بنیاد جاگیر
داری اور مذہب کی خود اجارہ داری کے دستور میں وہ مبتلا ہو گئے اگرچہ اس کے
ساتھ تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے کہ قصداً وارادۃً ذیلی اختلافات کے ان قصوں کو
چھیڑ کر کبھی کبھی ناواقف مذہب مسلمانوں کے اندر ہنگامہ پیدا کرنے کی بیہودہ
کوششیں بھی کی گئیں۔ بات بتنگڑ بنی، گل پھول بنا کر سب بنا دیا گیا جو کچھ نہ تھا قرار دیا
گیا کہ وہی سب کچھ ہے۔

یوں خدا اجتہاد کے ماننے والوں کو ٹکڑیوں میں بانٹ بانٹ کر اپنی شکم
پروری کا سامان بھی ماننا چاہیے کہ بعض سیاہ سینہ افراد نے کیا۔ تو ہم نہیں کہہ
سکتے کہ اختراعی کی جو شکلیں مسلمانوں کے اندر زوال حکومت کے بعد پیدا ہوئیں
ان میں بھی شکمی کاروبار والوں کا ہاتھ تھا یا نہیں۔ بلکہ عرض کر چکا ہوں میرا خیال
یہی ہے کہ زیادہ تر اسی نفسیاتی روگ کی پیداوار ہے جس کو بدقسمتی سے اس
زمانہ میں وراثت ہی سے تعلق تمام ہو گیا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں شکمی

"رے" جس کے کھنڈروں کے پاس آجکل طہران کا شہر آباد ہو گیا ہے اسی رے کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"تینوں (شافعیوں، حنفیوں) کو اس شہر میں لڑا دیا گیا اور ستا لڑایا گیا کہ برابر
دونوں ساتھیوں اور تعصبوں نے اپنی اپنی پارٹی کی حمایت کے لئے برسر
آتے رہتے تھے ان خونریزیوں ہوئیں کہ بالآخر رے کا اکثر
حصہ ویران و برباد ہو کر رہ گیا۔"

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے فروعی اختلافات سے ناجائز اور قطعاً ناجائز انتہا پسندی کی ناپاک کوششیں تھیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں قصابوں، درزیوں، بڑھئیوں یا اسی قسم کے بے چارے عامیوں، ناواقفوں کو بے وقوف بنا کر کام نکالنے والے اس زمانے میں بھی کام نکالتے تھے اور آج بھی اس راہ میں کامیابی کیلئے عوام کے ان ہی طبقات کو چنا جاتا ہے ورنہ جہاں کے مسلمان پڑھے لکھے اور صاحب فہم و بصیرت تھے ان ہی مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرقوں کی دال نہیں گلتی تھی۔ مقدسی کی کتاب میں ان کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ قیروان جو کسی زمانہ میں افریقہ کا سب سے بڑا مرکزی شہر اور لکھوکھا کی آبادی والا تھا۔ مقدسی نے وہاں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس شہر میں حنفی بھی ہیں اور مالکی بھی لیکن ان میں کسی قسم کی کوئی کشمکش اور جھگڑے نہیں ہیں سب مل جل کر محبت و الفت کی زندگی بسر کرتے ہیں" (ص ۲۲۵)۔

جس سے معلوم ہوا کہ مذہبی اختلافات میں بجائے خود فتنہ و فساد شقاق و نفاق کے جراثیم پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ ابھارنے والوں کا جب جی چاہتا ہے یا ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان میں بھی باہر سے زہر بھر دیتے ہیں اسی جہاں گرد جہاں گیر سیاح سے

احسن التقاسیم ص ۳۲۶ ۔ حکومت کو رفع نزاعی کی ضرورت ہوتی ہے۔

خراسان کے شہر سرخس میں پہنچے تو پایا کہ شیعوں کو یہاں مرد سیہ کہتے ہیں اور شافعیہ اپنے آپ کو اہلیہ کہتے ہیں آئے دن ان میں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ہرات میں بھی تماشہ انہوں نے دیکھا ہے کیونکہ معتزلہ میں بھی مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے دیکھا کہ:-

"وہاں کے جزارین (قصابوں) اور تیاغین (دورزیوں) میں خوب جھگڑے ہوتے ہیں۔ قصابیوں کی پارٹی سنی بن کر لڑتی تھی اور دورزیوں کی شیعہ بن کر ان پر چڑھائی کرتے تھے۔ ص ۳۳۳"

عرب ہی کے مقام یمامہ میں پہنچے، تو لکھا ہے کہ:-

"وہاں دیکھا کہ قصابوں کی ٹولی الگ ہے اور بدووں سے الگ لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے روزی جھگڑے بڑھتے ہوئے اس نوبت کو پہنچ چکے ہیں کہ جامع مسجد تک کلان لوگوں نے بٹوارہ کر لیا ہے۔ جب کوئی مسافر باہر سے ان کے یہاں آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں میں سے جس کے پاس تمہارا جی چاہے ٹھہر سکتے ہو ورنہ پھر یہاں سے نکل جاؤ۔ ص ۱۰۲"

بصرہ میں بھی بیان کیا ہے کہ

"شہریوں کو بھی ان ہی مذہبی تعصبوں کے خبط میں لوگوں نے بانٹ رکھا ہے۔ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور اطراف نواح کے قصبوں؛ دیہاتیوں سے بھی لوگ ہر ایک کی مدد کیلئے آتے ہیں۔"

کتاب تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے لیکن یاد آتا ہے کہ معجم البلدان میں

احمقوں کی جنت

"احمقوں کی جنت" بعض معنوں میں اگر مالیخولیا کی کوئی شکل ہو سکتی ہے تو شاید یہی تجویز ہو سکتی ہے آپ دیکھ چکے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کو بھی جب بآسانی مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا جا سکتا ہے اور ایک فرقہ کو لے کر دوسرے فرقہ کے سر پر پٹکنے والے بہ سہولت تمام پنپ سکتے ہیں تو "نیا ایک مذہب" کی صحیح تعریف کیا کی جاتی ہے۔ جب حنفیوں کو شافعیوں سے لڑایا جا سکتا ہے ایک کا خون دوسرے کے ہاتھوں بہانے میں بھی کامیابی حاصل کرنے والے کامیابی حاصل کر چکے ہیں تو آخر مذہبی وحدت کا ایسا قالب کون بنا سکتا ہے جس میں قطعاً کسی اختلاف کی سرے سے گنجائش باقی نہ رہے۔ پھر تو مذہب کو ختم کر کے انسانوں کے باہمی اختلافات کے فتنوں کو ختم کرنا چاہیے

ہم نے تو کئی سو سال پہلے دیکھا تھا کہ جہاں مذہبی تعصبات نہ تھے وہاں غیر مذہبی عصبیتوں کی بنیاد پر لوگ آپس میں الجھے ہوئے تھے" لیکن ہم تو اپنی آنکھوں سے آج دیکھ رہے ہیں۔ ہماری صدی ہی اسی تماشے میں گزر رہی ہے کہ ایک ہی دین ایک ہی نبی ایک کتاب کے ماننے والے بلکہ ایک ہی رنگ تقریباً ایک ہی نسل ذات کے ٹھہر ٹھہر کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے میں لگے رہے ہی نہیں بلکہ کروڑہا کی تعداد میں مقتولوں کی فہرستیں مسلسل بنتی چلی جا رہی ہیں۔ تقسیم کیلئے معمولی معمولی بہانے تراش لئے جاتے ہیں آخر جب کالے رنگ کے چہرے والوں کو اجلی کھال والوں سے رنگ کے اختلافی پہلو کو اب زیر غور کر دیا جاتا ہے تو کسی زمانہ میں پیشہ آمدنیوں کی ایک صف بنا کر دولت مندوں سے چھوٹے کمانے والوں کو بڑے لان والوں سے ٹکرا دینے کو آپ عجیب بات کیوں سمجھتے ہیں۔ زمین کے قرضی ودیعی حدود کو وطن کا نام دے کر جب عوام کو کٹوایا جا رہا ہے تو اس

نے ایک موقعہ پر بڑی دلچسپ تجربہ کی عبرت آموز تعبیر دی ہے بلخ کے متعلق یہ لکھ کر کہ:

"اس شہر کو مذہبی جھگڑوں سے دیکھ کر پاک ہے"

آگے وہی اعلان دیتے ہیں کہ:

وبالجملۃ عصبیات غیر الملۃ اشد — یعنی بجائے مذہب کے دوسری غیر مذہبی تعصبات

وکذلک فی جمیع البلدان — کا زور ہے اور اسی طرح تمام شہروں میں کسی نہ کسی قسم کا

عصبیات ص ۲۳۶ — تعصب پایا جاتا ہے۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے اور یہی واقعہ ہے عرض کر چکا ہوں کہ نوع انسانی کے افراد میں وحدت کے ساتھ کثرت! اور اختلافات کے پہلوؤں کا پایا جانا ایک ناگزیر قدرتی واقعہ ہے لیکن اختلاف کے ان پہلوؤں کے استعمال میں آپ کو اختیار ہے چاہے فتنہ و فساد کے بھڑکانے میں ان کا استعمال کیجئے یا چاہے گلہائے رنگ رنگ کو زینت چمن قرار دے کر ان سے منافع حاصل کیجئے۔

دینی قوموں کے خصوصی اوطان

سادہ دلوں کا ایک گروہ باور کئے ہوئے ہے کہ سارے جھگڑے مذہبی اختلافات ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا تو دنیا کو مذہب اور دین کے عنصر سے کلیتہً خالی کر دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو دنیا کو جنت بنا لینے کی ایک شکل احمقوں نے یہ تجویز کی ہے کہ زمین کے ہر حصہ کو کسی خاص دینی فرقہ کا وطن بنا دیا جائے جب یہ ہو جائے گا تو نہ تنہا بیخودگی یہی باور کئے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کراتے پھرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں رگڑوں سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جائے گی۔

صلی اللہ علیہ وسلم

سیرۃ رسولِ اکرم

منتخب از تصانیف

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

ترتیب

محترم جناب محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہم

ادارہ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

ادارہ اسلامیات

○ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ——— فون: ۷۲۴۴۴۱۲ فیکس: ۷۳۲۴۶۸۵ ۴۲ ۹۲

○ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ——— فون: ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۲۵۳۲۵۵

○ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی ——— فون: ۷۷۲۲۴۰۱